تفہیم PUBLICATION

سات دریاؤں کا پانی

دلاور علی آزر کی غزلیں

سات دریاؤں کا پانی

دلاور علی آزر کی غزلیں

مرتبین:
لیاقت جعفری
ڈاکٹر محمد سلیم
عمر فرحت

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

SAAT DARYAON KA PAANI

(Poetry)

by: Dilawar Ali Azar

Compiled by
Liaqat Jafri
Dr. Mohd. Saleem
Omar Farhat

Year of Edition 2017
ISBN 978-93-86624-21-5

Price Rs. 400/-

نام کتاب	:	سات دریاؤں کا پانی
شاعر	:	دلاور علی آزر
مرتبین	:	لیاقت جعفری / ڈاکٹر محمد سلیم / عمر فرحت
قیمت	:	۴۰۰ روپے
اشاعت	:	۲۰۱۷ء
تعداد	:	۵۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶
پیش کش	:	تفہیم پبلی کیشنز، راجوری

ملنے کے پتے

☆ شب خون کتاب گھر، الہ آباد

☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ☆ تفہیم پبلی کیشنز، راجوری

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

مقصود حسن

اور

نوید فدا ستی

کے توسط سے

آنے والی نسلوں کے نام

پانی

مآخذ

اور

کیمیا کا شاعر

شعر وہ لکھو جو پہلے کہیں موجود نہ ہو
خواب دیکھو تو زمانے سے الگ ہو جاؤ

زنجیر

سات دریاؤں کا پانی

○

یوں دیدۂ خوں بار کے منظر سے اُٹھا مَیں
طوفان اُٹھا مجھ میں سمندر سے اُٹھا مَیں

اُٹھنے کے لیے قصد کیا مَیں نے بلا کا
اب لوگ یہ کہتے ہیں مقدر سے اُٹھا مَیں

پہلے تو خد و خال بنائے سرِ قرطاس
پھر اپنے خد و خال کے اندر سے اُٹھا مَیں

اِک اور طرح مجھ پہ کھُلی چشمِ تماشا
اِک اور تجلّی کے برابر سے اُٹھا مَیں

ہے تیری مِری ذات کی یکتائی برابر
غائب سے تُو اُبھرا تو میسّر سے اُٹھا مَیں

کیا جانے کہاں جانے کی جلدی تھی دمِ فجر
سورج سے ذرا پہلے ہی بستر سے اُٹھا مَیں

پتھرانے لگے تھے مِرے اعصاب کوئی دم
خاموش نگاہوں کے برابر سے اُٹھا مَیں

اِک آگ مِرے جسم میں محفوظ تھی آزر
خس خانہء ظلمات کے اندر سے اُٹھا مَیں

O

درونِ خواب نیا اک جہاں نکلتا ہے
زمیں کی تہہ سے کوئی آسماں نکلتا ہے

بھلا نظر بھی وہ آئے تو کس طرح آئے
مرا ستارہ پسِ کہکشاں نکلتا ہے

ہَوائے شوق یہ منزل سے جا کے کہہ دینا
ذرا سی دیر ہے بس کارواں نکلتا ہے

مری زمین پہ سورج بوقتِ صبح و مسا
نکل تو آتا ہے لیکن کہاں نکلتا ہے

مقامِ وصل اک ایسا مقام ہے کہ جہاں
یقین کرتے ہیں جس پر گُماں نکلتا ہے

یہ جس وجود پہ تم ناز کر رہے ہو میاں
یہی وجود بہت رائگاں نکلتا ہے

بدن کو چھوڑ ہی جانا ہے روح نے آزر
ہر اک چراغ سے آخر دھواں نکلتا ہے

○

بدن میں کون اُجالا لکیر کھینچتا ہے
کہ جیسے خاک پہ دریا لکیر کھینچتا ہے

کسی کسی کو ہے تربیتِ سُخن سازی
کوئی کوئی ہے جو تازہ لکیر کھینچتا ہے

جب اور کوئی مدد کے لیے نہیں آتا
تو عشق دشت میں تنہا لکیر کھینچتا ہے

مَیں دائرے کے تسلُط سے جب نکلتا ہُوں
وہ اِسم پڑھ کے دوبارہ لکیر کھینچتا ہے

عجَب نہیں ہے کہ ہم خاک پر جُدا ہُو جائیں
غضَب نہیں ہے کہ لمحہ لکیر کھینچتا ہے

وہ اپنے بخت کا لکّھا بھی کاٹ سکتا تھا
جو اپنے ہاتھ پہ تازہ لکیر کھینچتا ہے

قبولیت کی گھڑی ہے دعا کریں آزرؔ
فلک پہ سُرخ ستارہ لکیر کھینچتا ہے

O

عجیب رنگ عجب حال میں پڑے ہُوئے ہیں
ہم اپنے عہد کے پاتال میں پڑے ہُوئے ہیں

سُخن سرائی کوئی سہل کام تھوڑی ہے
یہ لوگ کس لئے جنجال میں پڑے ہُوئے ہیں

اُٹھا کے ہاتھ پہ دنیا کو دیکھ سکتا ہُوں
سبھی نظارے بس اک تھال میں پڑے ہُوئے ہیں

مَیں شام ہوتے ہی گردوں پہ ڈال آتا ہوں
ستارے لپٹی ہوئی شال میں پڑے ہوئے ہیں

وہ تو کہ اپنے تئیں کر چکا ہمیں تکمیل
یہ ہم کہ فکرِ خد و خال میں پڑے ہوئے ہیں

جہاں بھی چاہوں مَیں منظر اُٹھا کے لے جاؤں
کہ خواب دیدہء اموال میں پڑے ہوئے ہیں

تمام عکس مِری دسترس میں ہیں آزر
یہ آئنے مری تمثال میں پڑے ہوئے ہیں

○

کب تک پھروں گا ہاتھ میں کاسہ اٹھا کے میں
جی چاہتا ہے بھاگ لوں دنیا اٹھا کے میں

ہوتی ہے نیند میں کہیں تشکیل خد و خال
اٹھتا ہوں اپنے خواب کا چہرہ اٹھا کے میں

بعد از صدائے کن ہوئی تقسیم ہست و بود
پھرتا تھا کائنات اکیلا اٹھا کے میں

بڑھنے لگا تھا نشۂ تخلیق آب و خاک
وہ چاک اٹھا کے چل دیا کوزہ اٹھا کے میں

کیوں کر نہ سہل ہو مجھے راہ دیار عشق
لایا ہوں دشت نجد کا نقشہ اٹھا کے میں

اب مجھ کو اہتمام سے کیجے سپرد خاک
اکتا چکا ہوں جسم کا ملبہ اٹھا کے میں

اچھا بھلا تو تھا تن تنہا جہان میں
پچھتا رہا ہوں خلق کا بیڑا اٹھا کے میں

آزر مجھے مدینے سے ہجرت کا حکم تھا
صحرا میں لے کے آ گیا خیمہ اٹھا کے میں

○

پاؤں توفیق سے رکھیے گا زمیں چلتی ہے
یہ خرابہ ہے فقیروں کی یہیں چلتی ہے

بات کرتا ہے یہاں تان کے سینہ یہ چراغ
اِن مَنڈیروں پہ ہواؤں کی نہیں چلتی ہے

اِک ستائش کہ جسے دل کی تسلی کہیے
اِک نمائش جو سرِ عالم دیں چلتی ہے

دشت در دشت رواں ہے یہ گھنی موج کہاں
کن جہانوں کے تعاقب میں زمیں چلتی ہے

کیوں نہ قربان ہوں اِس پر کہ ہوائے گزراں
کہیں رک جاتی اے دوست کہیں چلتی ہے

سوچتے رہتے ہیں کمرے میں پڑے صبح و مسا
کیسی تنہائی سرِ عرشِ بریں چلتی ہے

سانس کی ذیل میں آزردہ ہی رائے ہے مری
چل نہیں پاتی مگر اپنے تئیں چلتی ہے

○

خود میں کُھلتے ہُوئے منظر سے نمودار ہُوا
وہ جزیرہ جو سمُندر سے نمودار ہُوا

میری تنہائی نے پیدا کیے سائے گھر میں
کوئی دیوار کوئی دَر سے نمودار ہُوا

چاروں اَطراف مِرے آئنے رکھے گئے تھے
مَیں ہی مَیں اپنے بَرابَر سے نمودار ہُوا

آج کی رات گذاری ہے دیے نے مجھ میں
آج کا دن مرے اندر سے نمودار ہُوا

کیا عجب نقش ہے وہ نقش جو اِس دنیا کے
کہیں اندر کہیں باہر سے نمودار ہُوا

ایک شعلے کی لپک نور میں ڈھل کر آئی
ایک کردار بَہتر سے نمودار ہُوا

حق کی پہچان ہُوئی خلق کو آزر اُس وقت
جب علی آپ کے بستر سے نمودار ہُوا

O

سات دریاؤں کا پانی ہے مرے کوزے میں
بند اک تازہ کہانی ہے مرے کوزے میں

تم اِسے پانی سمجھتے ہو تو سمجھو صاحب
یہ سمندر کی نشانی ہے مرے کوزے میں

میرے آباء نے جوانی میں مجھے سونپا تھا
میرے آباء کی جوانی ہے مرے کوزے میں

چاروں سمتوں میں کوئی شے بھی اگر ہے موجود
اُس نے وہ لا کے گرائی ہے مرے کوزے میں

آن کی آن گذرتا ہے زمانہ اِس پر
وقت کی نقل مکانی ہے مرے کوزے میں

جانے کس خاک سے یہ ظرف ہُوا ہے تعمیر
جانے کس گھاٹ کا پانی ہے مرے کوزے میں

دیکھنے والو نئے نقش ملیں گے تم کو
سوچنے والو گرانی ہے مرے کوزے میں

قرض ہے مجھ پہ جو اِک عکس تمنا آزر
اِس نے کیا شکل بنانی ہے مرے کوزے میں

○

ہوس سے جسم کو دو چار کرنے والی ہَوا
چلی ہوئی ہے گنہ گار کرنے والی ہَوا

یہیں کہیں مرا لشکر پڑاو ڈالے گا
یہیں کہیں ہے گرفتار کرنے والی ہَوا

تمام سینہ سپَر پیڑ جُھکنے والے ہیں
ہَوا ہے اور نگوں سار کرنے والی ہَوا

پڑے ہوئے ہیں یہاں اب جو سَر بریدہ چراغ
گزشتہ رات تھی، یلغار کرنے والی ہَوا

ہماری خاک اُڑاتی پھرے ہے شہر بہ شہر
ہماری روح کا اِنکار کرنے والی ہَوا

اِسی خرابے میں رہنے کی ٹھان بیٹھی ہے
بدن کا دشت نہیں پار کرنے والی ہَوا

نہ جانے کون طرف لے کے چل پڑے آزرؔ
دُھویں سے مجھ کو نمودار کرنے والی ہَوا

O

بے ساختہ آواز کے پیکر سے گزر جاؤں
منظر سے گزرتے ہوئے منظر سے گزر جاؤں

اِس بات پہ موقوف ہے صدیوں کی مسافت
اُس آنکھ میں ٹھہروں کہ برابر سے گزر جاؤں

مٹی کی طرح تُو بھی مِری حد سے نکل جائے
پانی کی طرح مَیں بھی تِرے سَر سے گزر جاؤں

مجھ سامنے رکھے ہوں مِرے پھول مِرے خواب
اکثر سے اُلجھتا ہُوا اکثر سے گزر جاؤں

اِس بار کوئی اور طلب ہو مرے دل میں
اِس بار تو موجود و میسّر سے گزر جاؤں

شورش سے کروں کارگہِ خاک کو پامال
امکان میں رکھے ہوئے اِس ڈر سے گزر جاؤں

اِک حشر اُٹھا دے مری شوریدہ مزاجی
خاموش اگر گنبدِ بے دَر سے گزر جاؤں

جس طرح گزرتا ہوں مَیں صحرائے جنوں سے
ایسے ہی کسی روز سمندر سے گزر جاؤں

دَم بھر کو رکوں قریۂ خاشاک میں آزرؔ
پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس پَر سے گزر جاؤں

O

مخفی ہیں ابھی درہم و دینار ہمارے
مٹی سے نکل آئیں گے اشجار ہمارے

الفاظ سے کھینچی گئی تصویرِ دو عالم
آواز میں رکھے گئے آثار ہمارے

زنگار کیا جاتا ہے آئینۂ تخلیق
اور نقش چلے جاتے ہیں بے کار ہمارے

کچھ زخم دِکھا سکتا ہے یہ روزنِ دیوار
کچھ بھید بتا سکتی ہے دیوار ہمارے

کیوں چار عناصر رہیں پابندِ شب و روز
آزاد کیے جائیں گرفتار ہمارے

کیوں شام سے ویران کِیا جاتا ہے ہم کو
کیوں بند کیے جاتے ہیں بازار ہمارے

کیا آپ سے اب سختی بے جا کی شکایت
جب آپ ہُوئے مالِک و مُختار ہمارے

تحسین طلب رہتے ہیں تا عُمر کہ آزر!
پیدا ہی نہیں ہُوتے طرَف دار ہمارے

O

مَیں سُرخ پھول کو چُھو کر پلٹنے والا تھا
وہ جذب تھا کہ مرا جسم کٹنے والا تھا

اُس ایک رنگ سے پیدا ہوئی یہ قوسِ قُزح
وہ ایک رنگ جو منظر سے ہٹنے والا تھا

مرے قریب ہی اِک طاق میں کتابیں تھیں
مگر یہ دھیان کہیں اور بٹنے والا تھا

عجیب شان سے اُتری تھی دھوپ خواہش کی
مَیں اپنے سائے سے جیسے لپٹنے والا تھا

طویل گفتگو ہوتی رہی ستاروں سے
نگار خانہء ہستی اُلٹنے والا تھا

زمیں پہ آمدِ آدم کا شور برپا ہوا
وگرنہ رزق فرشتوں میں بٹنے والا تھا

خدا کا شکر ہے نشہ اُتر گیا میرا
کہ مَیں سبو میں سمندر اُلٹنے والا تھا

لپک رہی تھی کوئی آگ اِس طرف آزر
مَیں اُس سے دور بہت دور ہٹنے والا تھا

O

ورَق پہ حرف و حکایات کے ستارے ہیں
تمام لفظ مُناجات کے ستارے ہیں

مَیں ڈوبتا ہوں اُدھر وہ طلوع ہوتا ہے
کہ دونوں مختلف اوقات کے ستارے ہیں

ہمارے ہاتھ میں ہے چرخِ نیلگوں کی عطا
ہمارے کاسے میں خیرات کے ستارے ہیں

دمک رہا ہے اگر آسمانِ شعر و سُخن
کئی تو اِس پہ مضافات کے ستارے ہیں

مَیں دل میں سینت کے رکھتا ہوں روشنی اِن کی
نظَر میں ارض و سماوات کے ستارے ہیں

تُو جانتا ہے کسے کتنی روشنی ہے بہت
سبھی ستارے ترے ہات کے ستارے ہیں

ہمارے بعد دھواں ہوگا آسماں آزرؔ
ہم آہ بھرتی ہوئی رات کے ستارے ہیں

○

دُور کے ایک نظارے سے نکل کر آئی
روشنی مجھ میں ستارے سے نکل کر آئی

جس نے کشتی کو ڈبویا سر و سامان سمیت
وہ گھنی موج کنارے سے نکل کر آئی

راکھ جھاڑی جو بدَن کی تو اچانک باہر
آگ ہی آگ شرارے سے نکل کر آئی

پیڑ مبہوت ہُوئے دیکھ کے اِس منظر کو
دُھوپ جب اُس کے اشارے سے نکل کر آئی

آنکھ میں اشک ریاضت سے ہُوا ہے پیدا
یہ نمی وقت کے دھارے سے نکل کر آئی

کون تکیہ کرے مہتاب کی اس روشنی پر
سامنے بھی جو سہارے سے نکل کر آئی

خود بھی حیران ہُوں یہ سوچ کے آزر اب تک
زندگی کیسے خسارے سے نکل کر آئی

O

ہر لحظہ چھلکتی رہے اندر سے بھری آنکھ
پابند نہیں رہتی سُمندر سے بھری آنکھ

تصویر سے آگے کی طلب تھی مرے دل میں
سو مَیں نے کسی اُور ہی منظر سے بھری آنکھ

ڈرتا ہُوں جنوں مجھ سے مرا خواب نہ لے جائے
خالی ہی نہ کر دوں کہیں بھیتر سے بھری آنکھ

اک جذب تھا الفاظ میں رکھا ہُوا جس نے
اندَر سے مرا دل بھرا باہَر سے بھری آنکھ

شاید اُسے امکان کا اندازہ نہیں تھا
جس شخص نے موجود و میّسر سے بھری آنکھ

جب کچھ بھی نہیں مل سکا رستے میں تو اک دن
ہم بادیہ پیماؤں نے صرصر سے بھری آنکھ

ورنہ مجھے کب ان پہ یقیں آنا تھا آزر
رنگوں نے مرے سامنے منظر سے بھری آنکھ

O
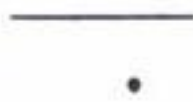
کوئی صدا نہ کوئی نوحہ کان پڑتا ہے
عجب سکوت ہے کیا کیا گمان پڑتا ہے

میں جھیلتا ہوں سرِ چشم سب نشیب و فراز
کہیں زمین کہیں آسمان پڑتا ہے

انڈیل دیتا ہوں میں اس میں اپنی آنکھوں کو
مجھے قریب ہی ک شمع دان پڑتا ہے

رکے جو شاخ گرہ ڈالتی ہے سانسوں میں
ہوا چلے تو بدن پر نشان پڑتا ہے

گریز لفظ ہی ہوتا ہے فیصلے کا جواز
سماعتوں پہ عجب وقت آن پڑتا ہے

عجب ہی کیا ہے کہ اس میں قیام ہو میرا
جو لامکان میں مجھ کو مکان پڑتا ہے

مرا اور اس کا تعلق عجیب ہے آزر
بس ایک خوابِ دگر درمیان پڑتا ہے

O

لوگ زندہ تھے خیالوں کے پری خانے میں
آنے والے نے بہت وقت لیا آنے میں

یک بہ یک پھول کھلے رنگ نے کروٹ بدلی
کون گلشن سے چلا آتا ہے ویرانے میں

یہ الگ بات کے نقشے میں نہیں ہے موجود
اِک خزانہ ہے اِسی دشت کے تہہ خانے میں

تُم کو معنیٰ سے علاقہ ہے تو رکھو صاحب
مَیں تو مصروف ہوں لفظوں کی ہوا کھانے میں

جانے یہ کون سے نقطے پہ رکے دیدہ و دل
اُلجھنیں بڑھتی چلی آتی ہیں سلجھانے میں

جو سمجھتا ہو اُسے بارِ دگر کیا کہنا
فائدہ کوئی نہیں بات کے دہرانے میں

صاحبِ کشف ہو آزر تو یہ بتلاؤ مجھے
دیر کتنی ہے درختوں پہ ثمر آنے میں

○

طاق پہ اُن کے پَر و بال سجائے گئے ہیں
جو پرندے کہیں دیکھے، نہ دِکھائے گئے ہیں

ابتدا یہ تھی کہ ہم باغ میں بیٹھے ہوئے تھے
انتہا یہ ہے کہ ہم دشت میں لائے گئے ہیں

یہ وہ دھڑکن ہے، جسے عشق ہُوا ہے تعلیم
یہ وہ آنکھیں ہیں، جنہیں خواب دِکھائے گئے ہیں

کیسی آواز کہ جو شور میں گُم ہو جائے
کون سے نقش جو پانی پہ بنائے گئے ہیں

اب کسی شکل کا پرتَو بھی نہیں لہروں پر
بر سرِ آب جو منظر تھے، مِٹائے گئے ہیں

دم بہ دم کھینچتی ہے اُس گُل خواہش کی مہک
ورنہ مٹّی میں کئی پھول کھِلائے گئے ہیں

تاکہ طیور یہاں نظمہ سرائی سیکھیں
اِن درختوں کو مرے گیت سُنائے گئے ہیں

آتشِ شوق نے سب یاد بھُلا دی اپنی
جانے ہم آپ جلے تھے کہ جلائے گئے ہیں

کوئی اِس رمز سے آگاہ کہاں ہو پایا
جسمِ امکان سے آگے نہیں سایے گئے ہیں

اور مَصرف ہی بھلا کیا ہے ہمارا، آزر!
آنے والوں کے لیے راہ بنائے گئے ہیں

O

تم جو کہتے ہو کہ اظہار کرو گے صاحب
شام کو اور پُراسرار کرو گے صاحب

جیسا محسوس کِیا ہم نے بتایا تم کو
اب فقیروں سے بھی تکرار کرو گے صاحب

یعنی اِس خواب کو تعبیر نہیں کر سکتے
گویا اِس خواب کو مسمار کرو گے صاحب

پہلے دن ڈوبا اور اب دل کی عجب حالت ہے
کب ستاروں کو نمودار کرو گے صاحب

بیٹھ کر سایۂ دیوارِ تمنا میں عبث
اِن درختوں کو نِگوں سار کرو گے صاحب

جسم سے ہوتے ہوئے روح تلک آؤ گے
دیر سے مجھ کو خبردار کرو گے صاحب

بود و نابود کے بارے میں نہ سوچو ورنہ
اپنے ہونے سے بھی اِنکار کرو گے صاحب

مَیں کہاں تک یونہی خاموش رہوں گا آزرؔ
تم کہاں تک مرا اِنکار کرو گے صاحب

○

شیشۂ وقت میں اب دیکھیے کیا ٹوٹتا ہے
شام ہوتی ہے کہ سورج کا نشہ ٹوٹتا ہے

بسترِ مرگ پہ کیوں خواہش نو روز کریں
نیند ٹوٹے تو کہاں خوفِ خدا ٹوٹتا ہے

کون جھانکے گا مِری روح کی گہرائی میں
کون دیکھے گا مِرے جسم میں کیا ٹوٹتا ہے

ایک ہُوتا ہے یہاں آ کے لہو اور پانی
جس جگہ مِلتا ہے ساحل اُسی جا ٹوٹتا ہے

عکس جم جاتے ہیں جب برف کی صورت مجھ میں
آئنہ ہُوتا ہُوا نقش بجا ٹوٹتا ہے

سر بہ سر وقت کو تجسیم کیا ہے مَیں نے
ایک لمحے سے فقط لمحہ نُما ٹوٹتا ہے

پیکرِ حرف عجب منبعِ منطق ہے میاں
سطر بن جائے تو مصرع میں خلا ٹوٹتا ہے

آسماں ٹوٹ چُکا اپنے سروں پر آزر
اب تو آنکھوں پہ کوئی سیل بلا ٹوٹتا ہے

O

زمیں سے کوئی تعلق نہ آسمان سے ہے
مرا خمیر کسی تیسرے جہان سے ہے

اگر یہ وسعتِ افلاک ہے تو کم ہے ابھی
طلب کچھ اور ہی مجھ کو مری اُڑان سے ہے

مکاں کو کوئی گلہ ہے تو وہ مکین کا ہے
مکیں کو کوئی شکایت ہے تو مکان سے ہے

تمام عمر کی جس میں تھکان اُترے گی
وہ ایک لمحہ بھی شاید تمہارے دھیان سے ہے

یہی سبب ہے کوئی فیصلہ نہ ہونے کا
مرا عدو بھی کسی اُونچے خاندان سے ہے

یہ بات بات پہ طعنوں سے لگ رہا ہے مجھے
کہ سم کا ذائقہ شاید تری زبان سے ہے

مجھے تو عشق کی آزر سمجھ نہیں آئی
یہ قصہ چھیڑ دیا تو نے درمیان سے ہے

———

○

مِٹی کی یاد دل سے بھلانا پڑے گی کیا
اِس دشت میں بھی خاک اُڑانا پڑے گی کیا

کل تک مری جبین پہ سلوٹ کہیں نہ تھی
یہ بات آئنے کو بتانا پڑے گی کیا

لکھ لکھ کے یونہی شعر مِٹاتا رہوں گا مَیں
اُفتادگیٔ طبع دکھانا پڑے گی کیا

یاد آ رہا ہے شام سے پیڑوں کا سبز جھنڈ
جنگل مَیں مجھ کو رات بتانا پڑے گی کیا

دھندلا چکا ہُوں زندگی مَیں اپنی آنکھ میں
چہرے پہ میرے گردِ زمانہ پڑے گی کیا

لکھنا پڑے گی قتل کی روداد ہو بہ ہو
کاغذ کو سُرخ آگ دکھانا پڑے گی کیا

آزرؔ نہ سہل ہُو گی یہ منزل خیال کی
مُشکل سے دھونی اپنی رمانا پڑے گی کیا

O

موج دَر موج مِری راہ میں اَنگ آتا ہے
مَیں وہ دریا ہوں جسے بہنے کا ڈھنگ آتا ہے

سال ہا سال خزاں جھیلنا پڑتی ہے۔ یہاں
مُدّتوں بعد کسی شاخ پہ رنگ آتا ہے

سوچتے سوچتے ہُوتی ہے وہ صورت مَعدوم
دیکھتے دیکھتے آئنے میں زَنگ آتا ہے

ذکر کیوں کیجے اگر ذکر نہیں اِس قابِل
بات کیوں کیجے اگر بات میں لَنگ آتا ہے

بے نیازانہ گُذرتے ہیں فقیر اِس رہ سے
نام جاتا ہے نہ اِس عشق میں نَنگ آتا ہے

اِس خرابے میں جو رہتے ہیں خبر ہے اُن کو
ناگہاں قافلۂ تیر و تفنگ آتا ہے

آزار اِس ہجر کے دوران کھُلا ہے کہ یہ جسم
سانس لینے کی مَشقت سے بھی تَنگ آتا ہے

○

ترے چراغ کی لو سے لہو لہان تھا مَیں
مگر تمام فرشتوں میں کامران تھا مَیں

وہ اِسم یاد ہے جو تم نے پڑھ کے پھونکا تھا
وہ رات یاد ہے جس رات نیم جان تھا مَیں

تمام آیتیں مجھ پر اُتاری جا رہی تھیں
اِک ایسے وقت میں جس وقت بے امان تھا مَیں

ادھر زمین ادھر آسمان دھرا ہوا تھا
عجیب حال تھا دونوں کے درمیاں تھا میں

یہ شکر ہے کہ تم آئے ہو اب مجھے ملنے
گئے زمانوں میں ویسے بھی داستان تھا میں

مجھے تو یاد نہیں زندگی مگر وہ لوگ
بتا رہے تھے کے اس وقت نوجوان تھا میں

نئے جہان کے کچھ پھول کھل رہے تھے وہاں
قدیم باغ میں رنگوں کے درمیاں تھا میں

سخن کے باب میں اِک نام ہے علی آزر
علی کے نام کا صدقہ ہے بے نشان تھا میں

○

عشق کو دین محبت کو دعا کہتا ہے
اِس پیمبر سے مِلو کِتنا نیا کہتا ہے

یہ الگ بات کہ سُنتا نہیں کوئی ورنہ
کچھ نہ کچھ قافلہء صوت و صدا کہتا ہے

دیکھ لیتے ہیں دِکھاتی ہے یہ دُنیا جو کچھ
مان لیتے ہیں بھَلے جو بھی خدا کہتا ہے

شوق کہتا ہے کہ منزل پہ رکھے اگلا قدم
راستے سے بھی تو کچھ پوچھیے کیا کہتا ہے

اپنا لکھا ہوا پڑھتا ہوں تو کھلتا ہے یہ رمز
کوئی تو ہے جو مجھے مجھ سے سوا کہتا ہے

میں سمجھتا تھا مری رائے ہی کامل ہے مگر
آئنہ آپ کے بارے میں بجا کہتا ہے

میرے اشعار پڑھو گے تو کھلے گا آزر
خواب الفاظ میں ڈھل جائے تو کیا کہتا ہے

○

چلے گا اور کوئی اِس پہ آگے آتے ہوئے
مَیں صرف ہوگیا جو راستہ بناتے ہوئے

روانہ ہوتا ہوں اِک صبح کے سفر پر مَیں
قدیم طاق میں اپنا دیا جلاتے ہوئے

رکا ہوں دیکھنے کو اور روز و شب میرے
گُذر رہے ہیں مری شعلگی بڑھاتے ہوئے

اِنہیں عبَر ہی نہیں اِن کے ساتھ کیا ہوگا
یہ لوگ خوش ہیں مِرے دائرے میں آتے ہوئے

وہ بے نیاز ہے اُس نے حساب کیا رکھنا
کسی کے دل پہ نئی روشنی گِراتے ہوئے

مَیں آن بیٹھا ہوں کس دائرے میں کیا معلوم
یہ کون لوگ ہیں پی کر سبو بڑھاتے ہوئے

کنارِ شام کی بابت بس اِتنا یاد رہا
پکارتے ہوئے دو ہاتھ ڈوب جاتے ہوئے

اَٹی ہے آنکھ مِری اپنی گرد سے آزرؔ
کٹے ہیں ہاتھ مِرے آئینہ اٹھاتے ہوئے

O

آزر رہا ہے تیشہ مرے خاندان میں
پیکر دکھائی دیتے ہیں مجھ کو چٹان میں

سب اپنے اپنے طاق میں تھرا کے رہ گئے
کچھ تو کہا ہوا نے چراغوں کے کان میں

مَیں اپنی جستجو میں یہاں تک پہنچ گیا
اب آئینہ ہی رہ گیا ہے درمیان میں

نِکلی نہیں ہے دل سے مرے بددعا کبھی
رکھے خدا عدو کو بھی اپنی امان میں

منظر بھٹک رہے تھے در و بام کے قریب
مَیں سو رہا تھا خواب کے پچھلے مکان میں

لذت ملی ہے مجھ کو اذیت میں اس لیے
احساس کھینچتا تھا بدن کی کمان میں

آزرؔ اِسی کو لوگ نہ کہتے ہوں آفتاب
اِک داغ سا چمکتا ہے جو آسمان میں

O

اور تو کیا حاصل تھا ہم کو، ہم اِک دشت کے آہُو تھے
دِل میں اُس کی یاد بسی تھی، آنکھ میں خواب ترازُو تھے

وقت کے ساتھ بدَل جاتی ہے کیفیّت سرشاری کی
صبح کے چہرے پر رونق تھی، شام کی آنکھ میں آنسو تھے

دھوپ کی شدَت سہہ کر مجھ کو، سایہ بہم پہنچاتا ہے
کِتنا اچھا پیڑ ہے بالکل جیسے میرے اَبُو تھے

کِن الفاظ میں لکھوں مَیں اُس حُسن کی حالت کا احوال
اُس کی آنکھیں آنکھیں تھی' اور اُس کے ابرُ و ابرُ و تھے

یہ ترتیب یقیناً مجھ کو حق کی طرف سے ہے تعلیم
سب سے آخری مَیں ہوں اِس میں 'سب سے پہلے "باھُو" تھے

جسم الگ ہُونے سے تھوڑی، قسم الگ ہو جاتی ہے
ایک ہی رنگ کے روپ ہیں سارے اِک تصویر کے پہلو تھے

مُدّت بعد ملے تھے آزر پورے چاند کی رات میں ہم
باہَر سے خاموش تھے دونوں، اندر سے بے قابُو تھے

O

نہ جانے وقت تھا یا وقت کا تقاضا تھا
زمین کانپتی تھی آسماں لرزتا تھا

بکھر رہے تھے مرے عکس چاپ سے اپنی
مَیں اپنا خواب لیے آئینوں سے گزرا تھا

اک ایسے موڑ پہ آ کر رکا مرا رہوار
جہاں نہ ابر تھا، نے دھوپ تھی، نہ سایہ تھا

خود اپنی دید پہ اپنی تلاش ختم ہوئی
عجیب حالتِ دل تھی، کہیں نہ لگتا تھا

کسی نے روک لیا وقت کو مِری خاطر
مَیں ایک لمحہ تھا، آ کر گزرنے والا تھا

عجیب خواب تھا اس جھیل کے کنارے پر
دمِ طلوع مجھے چاند ملنے آتا تھا

مِلا تو پوچھنا آزر کوئی قدیم چراغ
ہوا نے پہلا قدم کب زمیں پہ رکھا تھا

O

سب کو معلوم ہے مَیں ہُوں اُس کا
آئینہ ہو رہا فسوں اُس کا

وہ مجھے دیکھتا رہے اور میں
دیکھنا دیکھتا رہُوں اُس کا

مجھ میں اک شخص مرنے والا ہے
کوئی بتلائے کیا کروں اُس کا

میں کبھی بات کر سکوں اِس کی
میں کبھی نام لے سکوں اُس کا

میرے سینے کا زخم دیکھو تم
دیکھنا ہے اگر جنوں اُس کا

باغ کی سیر کو نکلتا ہوں
مَیں کوئی رنگ بھانپ لوں اُس کا

میرے حق میں دعا کیا کیجے
مَیں رہُوں اَور سدا رہُوں اُس کا

اُس کے ماتھے پہ داغ ہے آزرؔ
صاف شفاف اندروں اُس کا

O

آنکھ میں خواب زمانے سے الگ رکھا ہے
عکس کو آئنہ خانے سے الگ رکھا ہے

گھر میں گلدان سجائے ہیں تری آمد پر
اور اِک پھول بہانے سے الگ رکھا ہے

کچھ ہَوا میں بھی چلانے کے لئے رکھا جائے
اِس لیے تیر نشانے سے الگ رکھا ہے

اُس کے ہونٹوں کو نہیں آنکھ کو دی ہے ترجیح
پیاس کو پیاس بجھانے سے الگ رکھا ہے

غیر ممکن ہے کسی اور کے ہاتھ آ جائے
وہ خزانہ جو خزانے سے الگ رکھا ہے

اِک ہوا سی کہیں باندھی ہے چھُپانے کے لئے
اِک تماشا سا لگانے سے الگ رکھا ہے

خواب ہی خواب میں تعمیر کیا ہے آزرؔ
گھر کو بنیاد اُٹھانے سے الگ رکھا ہے

O

خود اپنی آگ میں سارے چراغ جلتے ہیں
یہ کس ہوا سے ہمارے چراغ جلتے ہیں

جہاں اُترتا ہے وہ ماہتاب پانی میں
وہیں کنارے کنارے چراغ جلتے ہیں

تمام روشنی سورج سے مُستعار نہیں
کہیں کہیں تو ہمارے چراغ جلتے ہیں

تمہارا عکس ہے یا آفتاب کا پرتَو
یہ خال و خد ہیں کہ پیارے چراغ جلتے ہیں

عجیب رات اُتاری گئی محبت پر
ہماری آنکھیں تمہارے چراغ جلتے ہیں

مِری نگاہ سے روشن نِگار خانۂ حُسن
مِرے لہو کے سہارے چراغ جلتے ہیں

نہ جانے کون سی منزل ہے مُنتظر آزر
کہ رہگُذر میں ستارے، چراغ جلتے ہیں

○

آگ لگ جائے گی اک دن مری سرشاری کو
مَیں جو دیتا ہُوں ہَوا روح کی چنگاری کو

ورنہ یہ لوگ کہاں اپنی حدوں میں رہتے
مَیں نے معقول کِیا حاشیہ برداری کو

یہ پرندے ہیں کہ درویش ہیں زندانوں کے
کچھ سمجھتے ہی نہیں امرِ گرفتاری کو

اَب ہمیں زندگی کرنے میں سہولت دی جائے
کھینچ لائے ہیں یہاں تک تو گراں باری کو

ایک طوفانِ بلا خیز نے منظر بدلا
پیڑ تیار ہُوئے رسمِ نگوں ساری کو

اُس نے وہ زہر ہَواؤں میں مِلا یا ہے کہ اب
کونپلیں سَر نہ اُٹھائیں گی نموداری کو

کون کھینچے گا مِرے جسم کی زنجیر آزرؔ
کون آسان کرے گا مری دشواری کو

O

پھینکو نہ یونہی کم نظر و سنگ ہوا میں
اُڑتے ہیں پرندے بھی اِسی تنگ ہوا میں

پھیلا مری آواز کا جادو سرِ دُنیا
بکھرا مِرا شیرازہء آہنگ ہوا میں

رکھیے اِنہیں موسم کی شکستوں سے بچا کر
پھولوں کو نہ لگ جائے کہیں زنگ ہوا میں

دو چند ہوئی جاتی ہے تعمیرِ سماعت
چلتا ہے ہَواؤں کے کوئی سنگ ہَوا میں

ممنون رہے گا مرے الفاظ کا پیکر
کرتا ہے وہ آواز مری رنگ ہَوا میں

ہوتا ہے مگر اور ہی لفظوں کا در و بست
بنتا ہے کوئی اور ہی آہنگ ہَوا میں

آزرؔ مجھے تخلیق کی وہ سطح ملی ہے
تصویر بنا سکتا ہوں نیرنگ ہَوا میں

O

برائے لیل و نہار آئینے سے گُذرے گا
جہاں کا گرد و غُبار آئینے سے گُذرے گا

لِپٹ لِپٹ کے جُدا ہو گا عکس خوش انداز
اُلجھ اُلجھ کے یہ تار آئینے سے گُذرے گا

کسی بھی نقش کو زنجیر کی نہیں حاجت
خود آپ چل کے شکار آئینے سے گُذرے گا

نظر نہ ہو تو سوال اُٹھتا ہے نظارے پر
بدن نہ ہو تو غبار آئنے سے گذرے گا

سبب بنا تو کُھلے گی گرہ تصور کی
مدد ملی تو مدار آئنے سے گذرے گا

اُٹھا کے دھند زمانوں کی خال و خد سے اُدھر
چراغِ عکس گذار آئنے سے گذرے گا

مَیں کس طرح اُسے پہچان پاؤں گا آزر
جو ایک ہو کے ہزار آئنے سے گذرے گا

O

اس آئینہ خانے میں رسَد چاہیے میری
سورج کو نکلنے میں مدَد چاہیے میری

میں ہوں جو مِلا سکتا ہوں خلقت کو خدا سے
مخلوق کو تقلید اشَد چاہیے میری

کچھ دیکھنے کو میری نظر چاہیے صاحِب
کچھ سوچنے کو تابِ خرَد چاہیے میری

کیوں مجھ کو مِٹانے سے گریزاں ہے تراہاتھ
کیا روشنی تا روزِ ابَد چاہیے میری

وہ مجھ میں سمایا ہے نہیں جس کی کوئی حد
بے حد ہوں مگر دنیا کو حد چاہیے میری

اِس عشق کو بھی میری توجہ کی ہوس ہے
اُس حُسن کو بھی دادوستد چاہیے میری

آتا ہے علی نام مرے نام میں آزر
ہر طالبِ رفعت کو سَنَد چاہیے میری

○

آدم کی تشنگی پہ نشانی حدیث ہے
دریا کے پاس سب سے پرانی حدیث ہے

ہر چیز اپنی اصل میں مستور رہے یہاں
ہر شے کی اصل ایک زمانی حدیث ہے

جاری رہے گا ارتقا اِس کائنات میں
بدلیں گے شکل لفظ و معانی، حدیث ہے

پتھر میں رزقِ زیست عطا ہو گا خلق کو
تاویل ہے کوئی نہ کہانی، حدیث ہے

آبادی اپنی حد سے تجاوز کرے تو پھر
ایسے میں کارِ نقل مکانی حدیث ہے

کچھ اس لیے بھی غرق ہُوئے ہیں گزشتگان
ہم نے خدا کی بات نہ مانی حدیث ہے

سچ ہے جو تُو نے آنکھ سے دیکھا ہے دہر میں
حق ہے ترا کہا ہُوا یعنی حدیث ہے

بہتر زمیں کی پیٹھ سے ہُوگا زمیں کا پیٹ
مومن پہ جب ہو زیست گرانی حدیث ہے

آزرؔ ہر ایک جنس گراں ہے جہان میں
مٹی حدیث ہے کہیں پانی حدیث ہے

O

بدَن کے دشت سے جب پار ہُونے لگتے ہیں
تو خواب اُور پُر اسرار ہُونے لگتے ہیں

عجب طرح ہمیں محروم کر دیا اُس نے
پرائی آگ میں سرشار ہُونے لگتے ہیں

اِس انہماک سے تکتا ہُوں اُس الاؤ کو مَیں
دھوئیں سے نقش نمودار ہُونے لگتے ہیں

ہَوائے صبح پلٹتی ہے جنگلوں کی طرَف
درخت نیند سے بے دار ہُونے لگتے ہیں

درود پڑھ کے قدم رکھا جائے دھرتی پر
تو خود ہی راستے ہموار ہُونے لگتے ہیں

وہ باغ چھوڑ کے جاتا ہے اور اُسی لمحے
یہ رنگ پھول سے بے زار ہُونے لگتے ہیں

تمام لفظ جو ترتیب سے رکھوں آزرؔ
خیال اپنے گرفتار ہُونے لگتے ہیں

O

وہ بہتے دریا کی بے کرانی سے ڈر رہا تھا
شدید پیاسا تھا اور پانی سے ڈر رہا تھا

نظر نظر کی یقیں پسندی پہ خوش تھی، لیکن
بدن بدن کی گماں رسانی سے ڈر رہا تھا

سبھی کو نیند آ چکی تھی یوں تو پری سے مِل کر
مگر وہ اِک طفل جو کہانی سے ڈر رہا تھا

لرزتے ہونٹوں سے گر پڑے تھے حروف اِک دِن
دِل اپنے جذبوں کی ترجمانی سے ڈر رہا تھا

لغاتِ جاں سے کشید کرتے ہُوئے سُخن کو
مَیں ایک حرفِ غلط معانی سے ڈر رہا تھا

جما ہُوا خون ہے رگوں میں نہ جانے کب سے
رکا ہُوا خواب ہے 'روانی سے ڈر رہا تھا

وہ بے نشاں ہے جسے نشاں کی ہَوس تھی، آزر
وہ رایگاں ہے جو رایگانی سے ڈر رہا تھا

○

بابِ غزل میں ہر سخن تازہ بند ہے
کب تک کھلے گا مجھ پہ جو دروازہ بند ہے

ٹھہرے ہوئے سرشک میں پیدا ہے موجِ بحر
سہمے ہوئے سکوت میں آوازہ بند ہے

یہ تہہ ہٹے تو اصل خد و خال دیکھنا
وہ حُسنِ بے مثال پسِ غازہ بند ہے

گر نیند آ بھی جائے تو کچھ فائدہ نہیں
دل کی طرف سے خواب کا دروازہ بند ہے

جاں نذرِ انتظار گذاری ہے عشق میں
دل تحفۂ وصال کا شیرازہ بند ہے

زیرِ زمیں نمو کے مسائل ہیں اور کچھ
مٹی میں دفن تخمِ گُل تازہ بند ہے

آزرِ گُل خیال سرِ شاخِ آرزو
خوشبو کے انتظار میں خمیازہ بند ہے

O

سخن کی ضرب سے ہر ساز میں گرہ پڑ جائے
مَیں لب ہلاؤں تو آواز میں گرہ پڑ جائے

ہَوس نے جسم کا انجامِ کار دیکھنا ہے
خدانہ خواستہ آغاز میں گرہ پڑ جائے

تری بَلا سے لہو کھینچ لے یہ جائے سرشک
پڑے تو چشمِ گُہر ساز میں گرہ پڑ جائے

یہ جُست جو ہی تو سانسیں بحال رکھتی ہے
کبھی جو دل کی تگ و تاز میں گرہ پڑ جائے

وہ مُنتشر ہے کوئی دیکھ لے اُسے جا کر
وہ مُنتظر ہے کہ انداز میں گرہ پڑ جائے

اُداس چاند سے مل آتی ہے چکورا بھی
اگر کہیں پرِ پرواز میں گرہ پڑ جائے

کُھلے جو حرفِ فسوں خیز کا فسوں آزر
ہر ایک رمز ہر اک راز میں گرہ پڑ جائے

○

کھینچ کر عکس فسانے سے الگ ہو جاؤ
بے نمو آئینہ خانے سے الگ ہو جاؤ

سارا دن ساتھ رہو سائے کی صورت اپنے
شام ہُوتے ہی بہانے سے الگ ہو جاؤ

شعر وہ لکّھو جو پہلے کہیں موجود نہ ہو
خواب دیکھو تو زمانے سے الگ ہو جاؤ

شاعری ایسے جھمیلوں سے بہت آگے ہے
اِس نئے اَور پُرانے سے الگ ہو جاؤ

نیند میں حضرتِ یوُسف کو اگر دیکھا ہے
عین ممکن ہے ' گھرانے سے الگ ہو جاؤ

احتراماً مرے حلقے میں رہے ہو شامل
اہتماماً مرے شانے سے الگ ہو جاؤ

اُس کو تصویر کرو صفحہء دل پر، آزر
غیب کا نقش بنانے سے الگ ہو جاؤ

O

چلے بھی آؤ کہ حُجت تمام ہُو چکی ہے
دِیا جلانے کا مطلب ہے شام ہُو چکی ہے

گُذر چکی ہے اذیت سے چشمِ خواب آثار
سکوتِ شب سے نظر ہم کلام ہُو چکی ہے

جھکائے رکھیں گے ہم یوں ہی اپنی گردن کو
وہ تیغِ تیز اگر بے نیام ہُو چکی ہے

جسے بھی دیکھیے ملتا ہے بے نیازی سے
محبتوں کی روش کتنا عام ہو چکی ہے

ہمارے خواب ہوا میں اُڑائے جائیں گے
ہماری نیند پرندوں کے نام ہو چکی ہے

وہ داستاں جو تہِ خاک و خوں لکھی گئی تھی
شروع ہونے سے قبل اختتام ہو چکی ہے

زمیں پہ حشر بپا ہونے کو ہے آخرِ کار
تمام خلق ہوس کی غلام ہو چکی ہے

بتاؤں کیا کہ مکمل مری حیات آزر
بغیر عشق بہ صد اہتمام ہو چکی ہے

○

مجھ کو مٹی سے علاقہ ہے اُسے پانی سے
گویا مِل سکتے ہیں دونوں بڑی آسانی سے

خطۂ چشم پہ ہر لحظہ نگہ رکھیے گا
خواہشیں نم نہ اُٹھا لیں کہیں نادانی سے

اِس سے پہلے کہ فرشتہ کوئی طعنہ دیتا
اِک ستارہ اُبھر آیا مِری پیشانی سے

اب مجھے سبز جزیرے پہ اُترنا ہی نہیں
اب ملاقات نہیں ہوگی جہاں بانی سے

دیکھتا کوئی نہیں آنکھ اٹھا کر مجھ کو
فائدہ کیا ہے مجھے چاکِ گریبانی سے

حیرتی کیوں ہیں مِری دشت نوردی پہ یہ لوگ
کیا محبت نہیں ہو سکتی بیابانی سے

آزرؔ اِس بار مقدر کو مقدر جانا
کاٹ لی میں نے پریشانی، پریشانی سے

O

کچھ اِس ادا سے رخِ عہدہ چمکتا ہے
کہ جیسے چاند سرِ آبِ جُو چمکتا ہے

ہماری آنکھیں دمکتی ہیں، دیکھنے سے اُسے
اور اُس کا چہرہ دمِ گفتگو چمکتا ہے

یہ سُرخ روشنی پھیلے گی وقت آنے پر
کہ زیرِ سایۂ خنجر گلو چمکتا ہے

کوئی تو ہے کہ جسے ضَو ملی ہے سورج سے
کوئی تو ہے جو مرے رو بہ رو چمکتا ہے

کچھ اِس طرح سے ہے روشن یہ داغِ پیشانی
کہ جیسے خاک پہ جَم کر لہو چمکتا ہے

وہاں حروف دمَکتے ہیں مثلِ کاہ کشاں
تِرا خیال جہاں چار سُو چمکتا ہے

نشے کی مار سے سینہ سلگ رہے ہوں گے
وہ تشنگی ہے سبو پر سبو چمکتا ہے

سنہری دھوپ اُجلتی ہے جسم و جاں آزر
تو ذرہ ذرہ نہاں مُو بہ مُو چمکتا ہے

O

اب کسی آنکھ کا جادو نہ فسوں ہے مجھ پر
پھر بھی یہ نشّہ سا طاری ہے تو کیوں ہے مجھ پر

یہ الگ بات بتانے کا نہیں اذن مجھے
آئنہ شش جہتِ کُن فیکوں ہے مجھ پر

خواہش نفس کہاں دل میں پنپ سکتی ہے
اِس سے پہلے بھی تمناؤں کا خوں ہے مجھ پر

کیا بتاؤں مری آنکھوں میں لہو ہے کیسے
مہرباں آج کل اک زخمِ دروں ہے مجھ پر

اِس قدر بار اُٹھائے ہوئے جاؤں تو کہاں
عشق مجھ پر ہے، خرد مجھ پہ، جنوں ہے مجھ پر

کوئی پوچھے جو مجھے دار و مدارِ ہستی
مَیں وہ سادہ کہ جواباً یہ کہوں ہے مجھ پر

حالت ایسی ہے کہ لگتا ہے کوئی پاس نہیں
وقت ایسا ہے کہ لگتا ہے سکوں ہے مجھ پر

آزرؔ اِس خواب سے نکلوں تو کہاں جاؤں مَیں
اس سے ہٹ کر بھی کوئی حالِ زبوں ہے مجھ پر

O

قتل کرتے ہُوئے رنگوں کی فراوانی تھی
باغ میں آنکھ کُھلی آنکھ میں حیرانی تھی

درمیاں عشق کا پردہ جو نہ حائل ہُوتا
میرے ہونٹوں کے مقابل تری پیشانی تھی

اِس لیے مجھ کو سہولت تھی سفر کرنے میں
میرا سامانِ سفَر بے سر و سامانی تھی

مَیں نے دیوار و در و بام کو تسلیم کیا
اُس سمے گھر سے نکلنا بھی تو نادانی تھی

وقت نے آ کے خبر دی تھی خزاں آنے کی
اِن درختوں نے مگر بات نہیں مانی تھی

وصل کی زندہ علامت تھی یہ روشن راتیں
چاند افلاک میں رکھی ہوئی عریانی تھی

کوئی تعبیر کا سودا جو نہیں تھا آزر
خواب ہی خواب تھے آسانی ہی آسانی تھی

O

بڑھالیا ہے جو ہم نے وہ ہاتھ کٹ جائے
دعا کریں کہ یہ قصہ یونہی نمٹ جائے

مجھے روانہ کیا جا رہا ہے اُس کی طرف
یہ کائنات اگر درمیاں سے ہٹ جائے

مَیں چاہتا ہُوں سو پہنچوں عدو کے خیمے تک
کہ عین وقت پہ میری بساط اُلٹ جائے

بڑھائی جائے کچھ اِس طرح وقت کی رفتار
دِیا جلانے سے پہلے ہی رات کٹ جائے

وہ موج موج سَمُندَر سوادِ ساحل سے
کچھ اِتنا غور سے دیکھو دَماغ پھٹ جائے

بس اُس کا نام ہی لکھا ہو برسَرِ قرطاس
سخن تمام اِسی نقطے میں سمٹ جائے

نِکل کے سامنے آئے وہ مطلعِ آزر
جو سر پہ چھایا ہُوا ہے یہ اَبر چھٹ جائے

O

بگڑ گئے ہیں بنانے سے خال و خط اُس کے
کیے ہیں عقل نے کچھ فیصلے غلَط اُس کے

وہی خیال ہے، جس سے جھلکتا ہو محبوب
وہی کتاب ہے، جس پر ہوں دست خط اُس کے

اُسی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں فرشتہ ہُوں
خدانہ خواستہ 'اندازے ہُوں غلَط اُس کے

ہُوا جو نقش مکمّل تو پھول تھا تصویر
بنا رہا تھا مَیں کاغذ پہ خال و خط اُس کے

اُسی کی روشنی اُور عکس ہیں جہاں بھر میں
چراغ جسم ہوئے آئنے نمط اُس کے

ہمی کو وہ کسی اِمکان میں نہیں رکھتا
ہم ایسے لوگ جو ہُوتے بھی ہیں فقط اُس کے

اِک ایک لفظ مرے دل پہ جیسے لکھتا ہو
لگا ہُوا ہے قلم کو عجیب قط اُس کے

کہ تا وہ اپنی کسی بات سے مُکر نہ سکے
سنبھال رکھے ہیں، آزر! تمام خط اُس کے

○

خواب کھلنے لگا آغازِ نمو میں اپنے
وہ خدوخال لہکتے ہیں لہو میں اپنے

دوست تو دوست ہے دشمن بھی برابر کا چنو
ہو بہ ہو ہم نظر آتے ہیں عدو میں اپنے

کیسے پہچانتی ہے آنکھ نئے لفظوں کو
کیسے رم کرتی ہے آواز گلو میں اپنے

ایک وہ پیاس جو بجھتی ہے سبو سے اپنی
ایک یہ آگ جو ہوتی ہے سبو میں اپنے

یہ کوئی چوغہ نہیں بیٹھ کے سی لیتے ہیں
زخم آتے ہیں کہاں دستِ رفو میں اپنے

دید ہُوتی ہے کسی موڑ پہ اُس کی یک دم
پھول کھلتے ہیں اچانک ہی لہو میں اپنے

شہر تو دیکھ لیا آنکھ میں رکھ کر خود کو
اب ذرا آپ مضافات بھی گھومیں اپنے

میں تیمم کو یہاں خاک طلب ہوں آزر
لوگ مصروف سرِ دست وضو میں اپنے

O

دیکھ لو پھر یہ ستارہ نہیں روشن ہونا
بجھ گیا میں تو دوبارہ نہیں روشن ہونا

لاکھ ترکیب کیے جاتے ہوں مٹی سے چراغ
کوزہ گر مان یہ گارا نہیں روشن ہونا

کشتیوں والے مِرا رمز سمجھتے ہوں گے
ایسے ہی مجھ پہ کنارہ نہیں روشن ہونا

ہو بھی سکتا ہے یہ آئینہ کسی پر روشن
ہاں مگر سارے کا سارا نہیں روشن ہونا

مجھ میں اِک آگ ہے جو آپ بھڑک اُٹھے گی
اِس طرح مجھ کو گوارا نہیں روشن ہونا

ہم جب آئے تو یہاں پہلے سے طے تھا سب کچھ
یعنی ایمان ہمارا نہیں روشن ہونا

کاش یہ اہلِ سخن بات کی تہہ تک پہنچیں
صرف لفظوں سے نظارہ نہیں روشن ہونا

اِک یہی بات تو روشن ہے ازل سے آزر
عشق میں سود و خسارہ نہیں روشن ہونا

O

سایۂ ابرِ گماں لے جاتا
دھوپ میں دشت جہاں لے جاتا

جل پری ہاتھ پکڑ لیتی مِرا
ناو کو آبِ رواں لے جاتا

عین اُسی لمحے تِری آنکھ کھُلی
ورنہ مَیں کون و مکاں لے جاتا

کوئی شعلہ سا لپکتا سرِ شام
اور دن بھر کا دھواں لے جاتا

بے اماں شب کا سفر تھا درپیش
جس طرف شورِ سگاں لے جاتا

عشق شمشیرِ گراں مایہ تھا
جو قریبِ رگِ جاں لے جاتا

کوئی خوشبو کہیں گویا ہوتی
پھول کا رنگ جہاں لے جاتا

زندگی ڈھونڈتی رہ جاتی مجھے
مَیں اگر نام ونشاں لے جاتا

چپ سوا چارہ نہیں تھا آزرؔ
اِتنی آوازیں کہاں لے جاتا

O

ورنہ رکنا تھی کہاں باغ میں یلغار مری
وہ تو مَس ہوگئی اِک شاخ سے تلوار مری

میری مِٹی پہ مرے گھر کی بناء رکھی گئی
میرے سائے سے اُٹھائی گئی دیوار مری

مَیں کسی وقت سَبک سَر تھا سُبک رو بھی تھا
مجھ سے مِلتی ہے تو رو پڑتی ہے رفتار مری

کاش وہ ساعتِ صد رنگ پلَٹ کر آ جائے
پیاس چمکی تھی تری آنکھ میں اِک بار مری

پھر بھی خاموش ہی رہتا ہوں مَیں اپنے گھر میں
بات سُنتے ہیں اگرچہ در و دیوار مری

مَیں کوئی دائرہ کھینچوں گا یہاں سب سے الگ
شوق غالب ہے سو رکتی نہیں پَرکار مری

آزرِ احباب کی طینت پہ گراں گذرے گی
آئے دن بڑھتی ہوئی قوتِ اظہار مری

○

منظر سے اُدھر خواب کی پسپائی سے آگے
مَیں دیکھ رہا ہوں حدِ بینائی سے آگے

یہ قیس کی مَسنَد ہے سو زیبا ہے اُسی کو
ہے عشق سراسر مری دانائی سے آگے

شاید مرے اجداد کو معلوم نہیں تھا
اِک باغ ہے اِس دشت کی پہنائی سے آگے

سب دیکھ رہی تھی پسِ دیوار تھا جو کچھ
تھی چشمِ تماشائی، تماشائی سے آگے

اِک دن جو یونہی پردہ افلاک اُٹھایا
برپا تھا تماشا کوئی تنہائی سے آگے

ہم قافیہ پیمائی کے چکر میں پڑے ہیں
ہے صنعتِ غزل قافیہ پیمائی سے آگے

مجھ کاغذی کشتی پہ نظر کیجے آزر
بڑھتی ہے جو لہروں کی توانائی سے آگے

O

ممکن ہے کہ ملتے کوئی دَم دونوں کنارے
اِک موج کے محتاج تھے ہم دونوں کنارے

یوں آنکھ جھپکتا نہیں بہتا ہُوا پانی
منظر میں نہ ہُو جائیں بہم دونوں کنارے

آباد ہمیشہ ہی رہے گا یہ سمندر
رکھتے ہیں مچھیروں کا بھرم دونوں کنارے

تا عُمر کسی موجہء خوش رو کی ہَوس میں
بے دار رہے دَم ہمادِم دونوں کنارے

کھلتی ہے یہاں آ کے مِرے خواب کی وسعَت
ہُوتے ہیں مِری آنکھ میں ضَم دونوں کنارے

یہ فاصلہ مٹّی سے کبھی طے نہیں ہُو گا
دریا کی ہیں وسعت پہ قسم دونوں کنارے

سب سیر کو نکلیں گے سرِ ساحل ہر خواب
سیاّحوں کے چومیں گے قدَم دونوں کنارے

کَشتی کی طرح عمر خضَر گیر ہے، آزر!
ہستی کے ہیں موجود و عدَم دونوں کنارے

○

زندگی راکھ سے تعبیر چراغوں کی نہ ہو
صرف جلنا ہی تو تقدیر چراغوں کی نہ ہو

طاق دیوار میں رکھتے ہوئے سوچا میں نے
کیوں عمارت کوئی تعمیر چراغوں کی نہ ہو

شام ہونے سے ذرا پہلے جلا لیجئے گا
ایک لمحے کی بھی تاخیر چراغوں کی نہ ہو

ایسی وحشت ہے کہ سائے سے گریزاں ہوا میں
روشنی مجھ سے بغلگیر چراغوں کی نہ ہو

سطر در سطر یہاں لفظ سے لو پھوٹتی ہے
یہ جو تحریر ہے تصویر چراغوں کی نہ ہو

کوئی شعلہ نہ بھڑک پائے سرِ طاقِ وجود
ایک خواہش بھی جو تسخیر چراغوں کی نہ ہو

دن نکلنے پہ ہی آمادہ نہیں ہے آزر
صبح کے پاؤں میں زنجیر چراغوں کی نہ ہو

O

شہر میں کوئی نہیں جس کو دعا دی جائے
سو مری عمر درختوں کو لگا دی جائے

سوئے رہ جائیں پسِ پردۂ شب ماہ و نجوم
آج کی رات چراغوں کو سزا دی جائے

اِنہیں اطراف میں موجود ہے وہ قوسِ قزح
آنکھ منظر کے تعاقب میں لگا دی جائے

مَیں نہیں کہتا مرے ساتھ چلیں نیند میں لوگ
کم سے کم خواب کی تعبیر بتا دی جائے

کوئی پہلو ہو کہ لفظوں میں دھڑک اُٹھے حیات
کوئی صورت ہو کہ یہ نام نہاد دی جائے

کھائے جاتا ہے شب و روز نئے عشق کا زعم
عین ممکن ہے تری یاد بھلا دی جائے

آزر اک اشک مری آنکھ سے رخصت کر کے
ایک شعلے کو مرے دل میں جگہ دی جائے

○

حالتِ حالِ دلِ زار کوئی سُنتا ہے
چُپ کھڑی رہتی ہے دیوار کوئی سُنتا ہے

بے طرح شور مچانے سے بھلا کیا ہو گا
کون سُنتا ہے مرے یار کوئی سُنتا ہے

شورشِ زخمِ تمنا ہے سرِ شاخِ وجود
دیکھنا یہ ہے کہ اِس بار کوئی سُنتا ہے

باغ میں کرتے ہیں سرگوشیاں گُل آپس میں
شاخ سے لگ کے یوں ہی خار کوئی سُنتا ہے

چاہیے ہے کسی خواہش کا سہارا مجھ کو
گرنے والی ہے یہ دیوار کوئی سُنتا ہے

رشک آتا ہے اُسے فنِ سُخن سازی پر
جب مرا مصرعِ تہہ دار کوئی سُنتا ہے

عالمِ ہست میں یوں حشر بپا ہُوں آزرؔ
جس طرح سے مرے اشعار کوئی سُنتا ہے

○

سلطنت جس کو میسر ہو فراوانی کی
اسے حاجت ہی کہاں تختِ سلیمانی کی

اِسم پڑھتے ہوئے ہونٹوں نے مرا بوسہ لیا
پل میں اوقات بڑھا دی مری پیشانی کی

اُس نے آہستہ سے انصاف کا پلڑا کھینچا
اور سنا دی گئی مٹی کو سزا پانی کی

دل سزاوار ہوا ساعتِ غفلت کے تئیں
ایک تو عشق کیا دوسرا نادانی کی

چشم بخشی ہے تو ظاہر ہے نظارا ہوگا
کوئی صورت نہیں بنتی یہاں حیرانی کی

تری آسانی نے مشکل میں مجھے ڈال دیا
مری مشکل نے ترے واسطے آسانی کی

بعد از میر کوئی اور سخن بنتا ہے
جانے کیا سوچ کے یاروں نے غزل خوانی کی

خلق سے خالق تخلیق عیاں ہے آزر
آئینہ شکل دکھاتا ہے جہاں بانی کی

O

کیا اذیت ہے کہ سرشار چلے جاتے ہیں
ہم محبت میں لگاتار چلے جاتے ہیں

تم نے دیوار سے بھی سَر نہیں پھوڑا جا کر
جانے والے پسِ دیوار چلے جاتے ہیں

خواب ایسا ہے جو تصویر نہیں ہو سکتا
نقش ایسے ہیں کہ بے کار چلے جاتے ہیں

سوچنے ہی میں اُبھرتی ہے وہ صورت کچھ دیر
دیکھنے سے لب و رخسار چلے جاتے ہیں

بے عبَر جاتے ہیں ہم راہ لیے بے عبَری
اُور عبَر دار عبَر دار چلے جاتے ہیں

ہم کو زنجیر دکھائی نہیں دیتی لیکن
سب گراں بارو گرفتار چلے جاتے ہیں

بیٹھے رہتے ہیں کُھلے میں کئی پہروں آزر
دھوپ چبھتی ہے تو اُس پار چلے جاتے ہیں

○

لوگ بھی کیسے خرابوں میں اُتر جاتے ہیں
آنکھ میں اشک میں خوابوں میں اُتر جاتے ہیں

پیاس منظر پہ دھری رہتی ہے تا عمر یونہی
ہم بدن لے کے سرابوں میں اُتر جاتے ہیں

خود میں اُلجھائے ہُوئے رکھتے ہیں پھر تارِ دماغ
کچھ سوال اپنے جوابوں میں اُتر جاتے ہیں

روٹیاں پیٹ میں جا کر یہ گواہی دیں گی
ہاتھ کے ذائقے چھابوں میں اُتر جاتے ہیں

کام نمٹا لیے سب شام سے پہلے، ہم نے
اب فراغت کے نصابوں میں اُتر جاتے ہیں

دیکھنے والے اُترتے ہیں کسی منظر میں
سوچنے والے عذابوں میں اُتر جاتے ہیں

ایسے الفاظ سے آزر ہے عقیدت مجھ کو
جو خیالوں سے کتابوں میں اُتر جاتے ہیں

○

کیا نہیں کرنا ہے کیا تشہیر کرنا ہے مجھے
فیصلہ خود ہی دمِ تحریر کرنا ہے مجھے

باندھنا ہے برسرِ قرطاس سرسوں کا طلسم
لہلہاتے کھیت کو تصویر کرنا ہے مجھے

کب کسی عجلت کا ہونا چاہتا ہوں مَیں شکار
خود سے ملنے میں بہت تاخیر کرنا ہے مجھے

بننے سے پہلے جہاں معدوم ہو جاتے ہیں نقش
اس خرابے میں بھی کچھ تعمیر کرنا ہے مجھے

صرف اک ذرہ اُٹھانا ہے سلگتی خاک سے
ساری دنیا کو کہاں زنجیر کرنا ہے مجھے

رنگ اُڑ جائیں گے شاخوں سے پرندوں کی طرح
اُس سے پہلے باغ کو تصویر کرنا ہے مجھے

آزر اک دن خواب سے اُس کو حقیقت میں کبھی
کھینچ کر لانا ہے اور تعبیر کرنا ہے مجھے

O

رنگوں کے پیچ و تاب میں تصویر الگ ہُوئی
آنکھوں سے خواب، خواب سے تعبیر الگ ہُوئی

آ کر لکیر کھینچ دی منظر میں وقت نے
صبحِ ازل سے شامِ ابد گیر الگ ہُوئی

تجھ اِسم نے دماغ دیا خاکِ دہر کو
سو خاک آئینہ الگ اکسیر الگ ہُوئی

رستے پہ حادثہ مجھے پیش آیا عشق میں
نقصان الگ ہُوا مرا تاخیر الگ ہُوئی

اُس نے ہوا میں ذائقہ تبدیل کر دیا
یوں شہد اُور شراب کی تاثیر الگ ہُوئی

وحشی کو شوق کھینچ کے لے آیا دشت میں
جیسے ہی اُس کے پاؤں سے زنجیر الگ ہُوئی

گر ہیں تمام کھل سکیں آزر بہ قدرِ شوق
قرآں الگ لکھا گیا تفسیر الگ ہُوئی

O

گل کوئی چیز ہے نہ گِل کوئی چیز
خود سے بڑھ کر نہیں سجل کوئی چیز

آج کل سائے کے علاوہ بھی
پیچھا کرتی ہے مستقل کوئی چیز

سانس کھینچوں تو ایسا لگتا ہے
ہے کسی چیز میں مخل کوئی چیز

کون سمجھا سکا ہے دنیا کو
جاں کوئی جنس ہے نہ دل کوئی چیز

اشک کا ذائقہ بدلتی رہی
میری آنکھوں سے مُتَصل کوئی چیز

زخم تو جوں کا توں ہے سینے پر
ہو رہی ہو گی مندمل کوئی چیز

میری آنکھوں میں مُنتشر کوئی خواب
میرے سینے میں مُشتعل کوئی چیز

ہے کوئی بات پُر اثر آزر
ہے کوئی چیز مُعتدل کوئی چیز

O

پنجاب کا موسم داخل ہو گا منظر کی شریانوں میں
سرسوں کے جب پھول کھلیں گے سندھ کے ریگستانوں میں

پیٹ کو بھرنے سے پہلے ہی نیت بھر کر شکر کیا
اُس کے ہاتھوں کی خوشبو موجود نہیں تھی کھانوں میں

میلے کچیلے ہاتھوں سے، ہم دوسری تہہ تک پہنچیں گے
نور سے مشتق ایک طہارت ہے تسبیح کے دانوں میں

ہونٹوں سے کچھ شبد گرے اُور گر کر چکنا چور ہُوئے
خاموشی بھرپور اذیت بن کر گونجی کانوں میں

ہم نقشے تک پہنچیں گے جب نقشہ دیمک چاٹ چکی
اُور خزانہ رکھا ہی رہ جائے گا تہ خانوں میں

اب کی بار بھی فصلیں اپنی نذرِ شعلۂ رحمت ہیں
آسمان پہ بادل گرجا آگ لگی کھلیانوں میں

سچ لکھو تو یاد رہو گے ورنہ یاد رہے آزرؔ
یاد نہ ہُونے کی اک خوبی ہُوتی ہے افسانوں میں

O

جو بھی ہُوا دُرست ہے ایسا بھی کیا غلَط کیا
ناخُن سے مَیں نے وقت کے چہرے پہ دست خَط کیا

آب وہَوائے دہر نے باندھا طلسم بے طرح
رنگوں میں جان ڈال دی پھولوں کو بے نمَط کیا

دستِ فسوں سرشت نے موئے قلَم سے خاک پر
مٹتی ہُوئی لکیر کو کھینچا اُور اُس کو خَط کیا

لکھنے سے پہلے گُفت گو لازم ہے اپنے آپ سے
ہم نے زبان کاٹ کر خامے کو زیرِ قط کیا

سب کو شناخت اُس نے دی پہچان کے لئے یہاں
سبزے میں رنگ بھر دیے مٹی کو خال و خط کیا

حرفِ سُخَن تمام ہے اب خامشی مُدام ہے
جذبے کو عمر سونپ دی لفظوں کو بے نقط کیا

آزرؔ ہر ایک لفظ کو ترتیب دی خیال میں
مجھ کو یہی دماغ تھا میں نے یہی فقط کیا

○

بے کار بیٹھنے سے تو بہتر ہے یوں نہ ہو
خلقت اگر برا بھی کہے عشق کیوں نہ ہو

اِک عمر یوں ہی مصرعءِ ثانی پڑا رہے
مَیں بار بار مصرعءِ اولیٰ کہوں نہ ہو

لفظوں کے ہیر پھیر سے بنتی نہیں ہے بات
جب تک سخن میں لذتِ سوزِ دروں نہ ہو

اب وصل پر بھی ہجر کا سایہ پڑا رہے
پہلو میں اپنے یار ہو اُس کا فسوں نہ ہو

جتنا میں اپنے ہونے سے نالاں رہوں، رہوں
جتنا تو مجھ سے کہتا رہے مَیں بھی ہوں نہ ہو

ہُونا ہے جو وہ ہو کے ہی رہنا ہے بات ختم
ہم لوگ لاکھ کہتے رہیں یوں ہو یوں نہ ہو

آزردہ آئے پُرسشِ احوال کے لیے
مجھ سے بیانِ حالتِ حالِ زبوں نہ ہو

O

گُذرا ہے کوئی عہد قرینے سے ہمارا
یہ زخم کُھلا وقت کے سینے سے ہمارا

ہم شام کی دہلیز پہ بیٹھے ہیں ابھی تک
اِک قافلہ نکلا تھا مدینے سے ہمارا

اک لہر یہاں آتی ہے نیندوں کے سفر پر
اُور خواب اُترتا ہے سفینے سے ہمارا

نقشہ یونہی صندوق سے نکلا نہیں اپنے
کچھ خاص تعلق ہے خزینے سے ہمارا

ہم لوگ جو گُم گشتہءِ تاریخ ہیں اک روز
پائیں گے سُراغ آپ دفینے سے ہمارا

کیا جانیے کس بات کا دھڑکا ہے نیا سال
دل ڈوب رہا پہلے مہینے سے ہمارا

سوچا ہے کہ دریافت کریں گے نئی دنیا
جی اُوبھ گیا قصد میں جینے سے ہمارا

اب تیرے سہارے کی ضرورت نہیں آزرؔ
اب پاؤں پھسلتا نہیں زینے سے ہمارا

O

جس احتیاط سے مصرع رفو کیا گیا ہے
میاں! یہ شعر نہیں دل لہو کیا گیا ہے

صلیبِ وقت پہ لٹکا دیا گیا ہے مجھے
جو چاہتا تھا وہی ہو بہو کیا گیا ہے

رہے یہ تشنگی تا حشر قائم و دائم
بلا کی پیاس میں ترکِ سبو کیا گیا ہے

تجھے اُٹھا کے فلک پر بٹھا دیا کس نے
مجھے رہین درِ آرزو کیا گیا ہے

یہ خواب ہے میں جسے جاگتے ہوئے دیکھوں
یہ آئینہ جو مرے چار سو کیا گیا ہے

وہ ایک اسم جو لوحِ ازل پہ لکھا گیا
وہ دل پہ نقش ہے اور ہو بہو کیا گیا ہے

سکوت ٹوٹنے والا کبھی نہیں آزرؔ
یہ اختیار دمِ گفتگو کیا گیا ہے

○

ہَوائے دل پہ اگر آپ کو یقیں آ تا
گُل سپید سرِ شاخِ یاسمیں آ تا

فضا جو رخ نہ بدلتی گھنی اُداسی کا
غبار ہُوتا ہُوا کارواں یہیں آ تا

کمال یہ ہے مجھے دیکھتی ہیں وہ آنکھیں
ملال یہ ہے اُنہیں دیکھنا نہیں آ تا

مہکتی وصل کی خوشبو سے رہگذارِ حیات
کسی کا ساتھ مُیَسر کہیں کہیں آ تا

ہم اپنی آنکھ ٹکاتے جدید گنبد پر
ہمارے پاؤں تلے فرشِ مرمریں آتا

جب اپنی اوک میں بھر لیتے پیاس منظر کی
کہیں سے بہتا ہُوا آبِ تیلمیں آتا

فسوں کا کوئی تعلق نہیں فسانے سے
کہانیوں پہ ہمیں کس لیے یقیں آتا

مَیں جس کی چاہ میں کاغذ سیاہ کرتا ہُوں
وہ لفظ برسرِ امکان کیوں نہیں آتا

سجے ہُوئے اُسے ملتے یہ سقف و بام آزر
مکانِ دل میں اگر وقت پر مکیں آتا

O

جل کے سب کچھ ہُوا دھواں مجھ میں
آگ ہی آگ تھی رواں مجھ میں

اپنی تنظیم لازمی ہے مجھے
دفن ہیں میرے رفتگاں مجھ میں

کیا کروں اور کس طرف جاؤں
مجھ کو ملتی نہیں اماں مجھ میں

جھانک کر دیکھتا نہیں کوئی
پھول کھلتے ہیں رائگاں مجھ میں

دیکھ لیتا نگاہ بھر اُس کو
اِس قدر تاب ہی کہاں مجھ میں

قرب کے ذکر سے بھی بعض اوقات
پھیل جاتی ہیں دوریاں مجھ میں

خامشی بین کرنے لگتی ہے
گونجتا ہے مرا مکاں مجھ میں

کوئی بھی مجھ کو پا نہیں سکتا
گُم ہے اِک ذات کا نشاں مجھ میں

کس کے قدموں کی چاپ ہے آزر
کون پھرتا ہے بے اماں مجھ میں

○

نیند میں کُھلتے ہُوئے خواب کی عُریانی پر
مَیں نے بوسہ دیا مہتاب کی پیشانی پر

اِس قبیلے میں کوئی عشق سے واقف ہی نہیں
لوگ ہنستے ہیں مری چاک گریبانی پر

نظر آتی ہے تجھ ایسوں کو شباہت اپنی
مَیں نے تصویر بنائی تھی کبھی پانی پر

ہم فقیروں کو اسی خاک سے نسبت ہے بہت
ہم نہ بیٹھے گے کبھی تختِ سُلیمانی پر

اس سے کچھ خاص تعلق بھی نہیں ہے اپنا
مَیں پریشان ہُوا جس کی پریشانی پر

آنکھ میں اشک کو اک رنگ دیا ہے خوں نے
اَور مجبور کیا وقت کو حیرانی پر

پاس ہے لفظ کی حُرمت کا وگرنہ آزر
کوئی تمغہ تو نہیں ملتا غزل خوانی پر

○

بنا رہا ہے وہ نقش اپنے ہُنر جو ہے شکل ساز اُس کا
وہ سب میں رہ کر بھی مختلف ہے یہی ہے اک امتیاز اُس کا

ملا تھا مجھ سے جو آسماں کے دبیز پردے کی چھاونی میں
دکھا دیا سب کو اُس کا چہرہ بتا دیا سب کو راز اُس کا

چمک رہا ہے وہ حُسن دل میں ہر ایک رخ سے ہر اک ادا سے
دمک رہا ہے مری نظر میں ازل سے ہی عکس ناز اُس کا

کھُلا ہے کیسا عجیب منظر اُٹھایا جانے لگا ہے لنگر
جزیرہء دل سے بحرِ جاں میں اُتر رہا ہے جہاز اُس کا

ہم اپنے سینے میں درد لے کر بھٹک رہے ہیں نہ جانے کب سے
کدھر گئے حضرتِ مسیحا کہاں گیا شاہ باز اُس کا

مَیں زینہ زینہ گذر رہا ہُوں خود اپنے دل سے خود اپنی جاں سے
سمجھ میں آنے لگا ہے کچھ کچھ خمِ نشیب و فراز اُس کا

نمو سے لبریز حرف جس کے تمام جذبے ہُوں صرف جس کے
نظر نہیں بے خُمار اُس کی سخن نہیں بے جواز اُس کا

عطائے خاص اُس پہ کیوں نہ ہُوتی جسے یقیں ہے اَحد پہ آزر
وہ اِس لیے معتبر ہے سب میں خدا ہے بندہ نواز اُس کا

O

رات کے سب مسافر پریشان ہیں آخرش ہم پکارے، کہاں جائیں گے
کس طرف جائے گی چاند کی روشنی صبحِ دم یہ ستارے کہاں جائیں گے

کس کو معلوم ہیں راہ کے پیچ وخم تم سمندر میں ہو اور ساحل پہ ہم
تم کہاں جاؤ گے زورقِ موج پر ہم کنارے کنارے کہاں جائیں گے

شہر ویران ہو جائیں گا ایک دن باغ تبدیل ہو جائیں گے دشت میں
دیکھیے رنگ اُڑتے ہُوئے پھول کا سوچیے یہ نظارے کہاں جائیں گے

ہجر جاری رہا گر سرِ دشتِ ہوا شک در اشک آنکھوں میں ہُو گا لہو
حد سے بڑھ جائے گا جب غمِ زندگی چڑھتے دریا اُتارے کہاں جائیں گے

چاند کے سامنے چاند آ جائے تو دفعتاً ایک حیرت میں ڈھل جائے گا
آئنہ دیکھ لے گر وہ آئنہ رو خال و خد اب سنوارے کہاں جائیں گے

بھید کھُل جائے گا خود ہی الفاظ کا ہے قرینہ یہ آزرؔ تگ و تاز کا
خواب ہو جائیں گی سب علاماتِ دل عشق میں استعارے کہاں جائیں گے

O

نفیِ احساس تھا اِثبات کہاں تک جاتا
لے کے تُو لب پہ سوالات کہاں تک جاتا

صبح تک آنکھ میں آیا ہے نکل کر دل سے
جانے یہ خوابِ طلسمات کہاں تک جاتا

دیکھتا ہُوں مَیں اُسے خود سے جُدا ہُوتے ہُوئے
سوچتا ہُوں وہ مرے ساتھ کہاں تک جاتا

مختصر یہ کہ مَیں بوسہ بھی غنیمت سمجھا
یوں ہی دورانِ ملاقات کہاں تک جاتا

یہ ہیولہ جو رکا ہے تری دنیا بن کر
یہ پس ارض و سماوات کہاں تک جاتا

اولیں دن کا بھی احوال بتایا ہم کو
صاحب کشف و کرامات کہاں تک جاتا

اس نے کاندھوں سے شب و روز جھٹک ڈالے ہیں
بوجھ اُٹھائے ہُوئے دن رات کہاں تک جاتا

مل گیا مجھ کو بھی اک آئنہ خانے کا سُراغ
ہُو گئی خود سے ملاقات کہاں تک جاتا

چاند تارے تو مرے بس میں نہیں ہیں آزر
پھول لایا ہُوں مرا ہاتھ کہاں تک جاتا

O

کیا نیا تماشا ہے آئنے کے پانی میں
موج ہے نہ چہرہ ہے آئنے کے پانی میں

ایک خواب آنکھوں کی خشک سرزمینوں پر
ایک خواب رکھا ہے آئنے کے پانی میں

رنگ آنے والے ہیں شاخِ نو دمیدہ پر
پھول کھلنے والا ہے آئنے کے پانی میں

وہ بھی اِس کنارے پر خیمہ زن ہیں مدت سے
جن کو ڈوب جانا ہے آئنے کے پانی میں

خال و خد کی لہروں میں بہہ گئی مری صورت
عکس ہے کہ دھوکا ہے آئنے کے پانی میں

سب کے سب تماشائی جانتے ہیں پہلے سے
کون ڈوب سکتا ہے آئنے کے پانی میں

بوند بوند حکمت سے حُسن کے نشانوں کی
بھیگتا سراپا ہے آئنے کے پانی میں

خواہشوں کو ملتے ہیں خال و خد یہاں آزرؔ
جانے اُور کیا کیا ہے آئنے کے پانی میں

———

○

ہونے تھے ہو رہے ہیں خسارے مرے بہت
گردش میں آج کل ہیں ستارے مرے بہت

کل آئنے کے کان میں اُس شوخ نے کہا
ملتے ہیں نین نقش تمہارے مرے بہت

محسوس ہو رہا ہے کہ وسعت پذیر ہوں
کچھ دن سے جھڑ رہے ہیں کنارے مرے بہت

میں جانتا ہوں لوٹ کے آنا نہیں تجھے
اے وقت مجھ کو جان سے پیارے مرے بہت

ہوتے مرے کسی کو نہیں تھا مرا خیال
میں چل پڑا تو خواب پکارے مرے بہت

پہلے تو چاک پر مری مٹی پڑی رہی
پھر کوزہ گر نے نقش نکھارے مرے بہت

آزر کیا اِسی لیے ہمزاد سے گریز
وہ بھانپنے لگا تھا اشارے مرے بہت

O

تغیرات کے مارے جگہ بدلتے ہیں
تمام رات ستارے جگہ بدلتے ہیں

ڈھلک ڈھلک کے اُترتی ہے خاک دریا میں
چھلک چھلک کے کنارے جگہ بدلتے ہیں

نکلنے والے نکل آئے اپنے دائرے سے
بدلنے والے سیارے جگہ بدلتے ہیں

مِری شباہتیں آئیں گی میرے بچوں میں
کہ خد و خال ہمارے جگہ بدلتے ہیں

درونِ خواب فسونِ گُل و گیاہ نہ پوچھ
قدم قدم پہ نظارے جگہ بدلتے ہیں

زمین گھومتی رہتی ہے آسمانوں کے گرد
اور آسمان بھی سارے جگہ بدلتے ہیں

ہم ایک لحظہ بھی پاتے نہیں سکوں آزرؔ
اگرچہ وقت کے دھارے جگہ بدلتے ہیں

○

وقت نے مجھ بدن کو آ لیا ہے
ڈھلتا سورج مِرا مثالیہ ہے

اُس سے بڑھ کر شکست کیا ہوگی
آئینے سے فریب کھا لیا ہے

مَیں نے اِک رات کی رعائت سے
اپنی مرضی کا دِن بنا لیا ہے

جسم پہنا ہے پیرہن کی طرح
کام چلتا نہ تھا چلا لیا ہے

مَیں ہی وہ بد دماغ ہوں جس کا
سارا لکھا ہُوا سوالیہ ہے

پہلے آنسو بنایا زخموں کو
بعد میں شاعری بنا لیا ہے

جسم کی کارگاہ میں رہ کر
روح کا بھید کس نے پا لیا ہے

کیا عجب واقعہ ہے ڈوبنے سے
اِک ندی نے ہمیں بچا لیا ہے

اب کوئی فائدہ نہیں آزر
اب تو شاخوں نے بور اُٹھا لیا ہے

○

اُس پھول سے دو چار کہیں تُم ہو کہیں مَیں
خوشبو کے گرفتار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

عجلت میں ہمیں وقت نے تعمیر کیا تھا
گرتی ہُوئی دیوار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

مشہور ہے اِس گاؤں میں یارانہ ہمارا
اور یارِ طرح دار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

آباد کناروں پہ قبائل ہیں ہمارے
دریا کے طرف دار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

ہر عکس دمکتا ہے سرِ آئنہ خانہ
منظر سے نمودار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

تحلیل کی خو خاک میں رکھی تھی احد نے
مٹتے ہُوئے آثار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

اس دشتِ حوادث کی کڑی دھوپ میں آزر
بے یار و مددگار کہیں تُم ہو کہیں مَیں

○

دشت بے آب ہے یاں پھول نہیں کھل سکتے
ہیں مُصر دل زدگاں پھول نہیں کھل سکتے

موسمِ گل تری صحبت کا اثر ہے دل پر
زخم کھلتے ہیں یہاں پھول نہیں کھل سکتے

تُو نہ ہو تو ترے ہونے کا گُماں رہتا ہے
خواب ہوتے ہیں جہاں پھول نہیں کھل سکتے

اِک ترا ساتھ ترا قرب ملے پل بھر کو
یار کھلنے کو کہاں پھول نہیں کھل سکتے

رت بدلنے میں ذرا دیر ہے پھر دیکھیے گا
کیا کہا ہم نفساں پھول نہیں کھل سکتے

زرد پڑتے ہوئے گلزار فلک آزردہ
ہے زمیں نوحہ کناں پھول نہیں کھل سکتے

مَیں بناتا ہوں جہاں قوس نہیں بن پاتی
مَیں کھلاتا ہوں جہاں پھول نہیں کھل سکتے

آ ذرا آ جائے گا رنگ ان کا تری آنکھوں میں
اِس قدر دِل میں نہاں پھول نہیں کھل سکتے

O

نیند میں خواب کُھلے خواب میں ہو نیل پَری
اچھی لگتی ہے مجھے کیفیتِ بے خبری

پھر وہی تو وہ ترا شہر ترے شہر کے لوگ
پھر وہی میں مرا کاسہ مری دریوزہ گری

ایک کونے میں بچھا یا ہُوا اُس شاہ کا تخت
کسی دربار کی مانند سجی بارہ دَری

ایک منظر کو بنانے میں ہُوئی عمر تمام
خوب احساسِ زیاں ہے یہ مری کم ہُنَری

ورنہ میرے لیے بے تاب کہاں تھا کوئی
مجھے اپنی ہی تگ و دو سے ملی خوش خبَری

مرے عیسٰی ترا مصرف ہی بھلا کیا ہوگا
وقت پر کام نہ آئی جو تری چارہ گری

آج تک خود میں کمی ڈھونڈ رہا تھا آزرؔ
آئنہ دیکھ کے یاد آئی تری دیدہ وَری

O

مَیں اکیلا تھا زمیں پر کہکشاں تک لے گیا
آسمانی شخص آیا آسماں تک لے گیا

جس بھنور سے کھیلتا تھا میں کنارے پر یونہی
موج میں آیا تو مجھ کو درمیاں تک لے گیا

تم ابھی اِس ہجر کو پہچان ہی پائے نہیں
یہ مری اِک اِک بہار اِک اِک خزاں تک لے گیا

وہ حقیقت تھی کوئی نہ خواب کا آغاز تھا
تو مجھے ہمراہ جانے کس جہاں تک لے گیا

کس نے دن کے طاقچے کو رنگ بخشا سرمئی
کون صحرا کو سنہرے سائباں تک لے گیا

اُس کے اندازِ بیاں نے سحر طاری کر دیا
کھینچ کر وہ مجھ کو اپنی داستاں تک لے گیا

جانے ہو کس موڑ پر آزرؔ مآلِ جستجو
جاؤں گا شوقِ سفر مجھ کو جہاں تک لے گیا

O

دن نکلتے ہی درختوں کا ہدف دھوپ ہوئی
اک طرف سایہ ہوا ایک طرف دھوپ ہوئی

سوچتے سوچتے آیا شب امکاں پہ یہ رنگ
دیکھتے دیکھتے دیوار سے لف دھوپ ہوئی

میں نے قرطاس پہ اس کو بھی کیا ہے تصویر
قبل از شام جو منظر سے حذف دھوپ ہوئی

روشنی کرنے کی سورج سے لگائی تھی شرط
میں چراغوں میں جلا اس کا شغف دھوپ ہوئی

صاف وشفاف مناظر ہیں جہاں تک دیکھو
آئینہ ہوتی ہوئی چاروں طرف دھوپ ہوئی

در بدر گھومتی پھرتی ہے کوئی پرچھائیں
ڈر کو اسباب ملا رات خلف دھوپ ہوئی

سارے ذرات چمکتے ہیں سر دشت بدن
اندرون چشم کھلی مہر بہ کف دھوپ ہوئی

پوچھنے والا کوئی ہو تو بتائیں آزر
کس طرف چاند گیا کون طرف دھوپ ہوئی

O

دیکھتے دیکھتے اِک منظر جب آنکھوں میں معدوم ہُوا
حُسن ہے کیا یہ جانا ہم نے رنگ ہے کیا معلوم ہُوا

لفظ اکٹھے کر لینے سے بات نہیں بنتی لیکن
کاغذ پر تصویر ہے سب کچھ جس سے جو منظوم ہُوا

تاریکی اور نُور میں کِتنا فرق ہے کس سے پوچھا جائے
صبح کا معنیٰ کیا نکلے گا رات کا کیا مفہوم ہُوا

باقی سب کچھ بے معنی ہے بے مصرف ہے لا یعنی ہے
علم وہی ہے اِس دنیا میں جس کو جو معلوم ہُوا

عشق میں یہ تہہ داری کیوں کر اپنی سمجھ سے باہر تھی
ہجر سے جاں سیراب ہُوئی جب وصل سے دِل محروم ہُوا

رات کی گدلی تاریکی میں منظر کِتنا روشن ہے
اِک چڑیا کو تنہا پا کر اِک جگنو مغموم ہُوا

پہنچ نہیں پائے ہیں آزر آج بھی ہم اُس مرکز تک
خاک جہاں تجسیم ہُوئی تھی وقت جہاں مقسوم ہُوا

○

سو بڑھ کے ختم ہُوا تھا نہ گھٹ کے ختم ہُوا
اندھیرا اپنے مقابل ہی ڈٹ کے ختم ہُوا

اُسی کا زہر رگ و پے میں دوڑتا ہے مری
وہ آبلہ جو مرے دل میں پھٹ کے ختم ہُوا

ٹھہر کے خواب میں منظر کی وسعتیں دیکھی
اُتر کے آنکھ میں دریا سمٹ کے ختم ہُوا

مگر وہ شب جو بکھر کر نہ ہو سکی معدوم
مگر وہ چاند جو ٹکڑوں میں بٹ کے ختم ہُوا

عجیب لہر اُٹھی تھی فراتِ ہستی سے
تماشا جس کا سفینہ اُلٹ کے ختم ہُوا

کسی بھی ہاتھ پہ اُس کے نشاں نہیں ملتے
وہ رنگِ سُرخ جو منظر سے ہٹ کے ختم ہُوا

سوائے شکر کے ہونٹوں پہ کچھ نہیں آزرؔ
مَیں اپنے دشمن جاں سے نمٹ کے ختم ہُوا

○

مجھ کو کیا کیا گماں یقیں پر تھا
رات بھر خواب کی زمیں پر تھا

دھند چھٹتی تو کچھ نظر آتا
ابر سا چشمِ سرمگیں پر تھا

پاؤں کے نیچے تھی زمین ابھی
آسماں بھی یہیں کہیں پر تھا

سب ستاروں کی مانگ خالی تھی
داغ مہتاب کی جبیں پر تھا

خاک گلزار ہونے والی تھی
نخل اک آبِ نیلمیں پر تھا

اس نے چہرے سے جب اٹھایا نقاب
میں وہاں تھا نہیں، نہیں پر تھا

کوئی دشمن نہیں بچا تھا مگر
ایک سایہ مری کمیں پر تھا

سارے منظر ہیں دیکھے بھالے ہوئے
گویا پہلے بھی میں یہیں پر تھا

آنکھ فانوس پر لگی ہوئی تھی
اور قدم فرشِ مرمریں پر تھا

سانپ پالا نہ تھا ابھی لیکن
شک مجھے اپنی آستیں پر تھا

میں بھی اس رات تھا وہیں آزرؔ
میرا ہمزاد بھی وہیں پر تھا

O

قوسِ قُزح کے رنگ مِری تصویر میں لانے والی ہے
منظر منظر آنکھ نہ جانے کیا دُہرانے والی ہے

عمر گُذاری منتظِری میں تب جا کر معلوم ہُوا
وصل کی ساعت ہجر سے بڑھ کر جی لرزانے والی ہے

سُن کر اِن سنگیت بھرے جھرنوں کی بہتی آوازیں
میرے اندر کی خاموشی باہَر آنے والی ہے

کون سنبھالے یاد کسی کے وصل میں گذرے موسم کی
بیتے دِنوں کی راکھ ہی دل میں خاک اُڑانے والی ہے

مَیں تو ازل سے بیٹھا ہوں سورج کی طرف چہرہ کر کے
وہ کیسے درویش ہیں جن کو دھوپ جلانے والی ہے

جن لہروں کو دیکھ رہا ہوں آزرؔ مَیں حیرانی سے
اِن لہروں کو دیکھ کے مجھ کو نیند بھی آنے والی ہے

O

وہ علاقہ دل ہے' جس میں سب مکینوں کے لیے
ایک جیسے گھر بنیں گے کچھ مہینوں کے لیے

شُکر کا سجدہ ادائی چاہتا ہے وقت پر
آستاں کا سنگ روشن ہے جبینوں کے لیے

جانے کن الفاظ کا جادو ہُنر کہلائے گا
جانے کس احساس کی رو ہے نگینوں کے لیے

خُون مہکایا گیا تھا زرد ہونٹوں کے سبب
آگ دِہکائی گئی ہے سرد سینوں کے لیے

اصطبَل خالی ہُوا تو شاہ نے تلقین کی
اَسپ ہُونے چاہئیں نایاب زینوں کے لیے

دوست دیکھے جا رہے ہیں تاکہ تنہائی مٹے
سانپ ڈھونڈے جا رہے ہیں آستینوں کے لیے

سیر کرنا اِن کو آزر اِس قدر آساں نہیں
آسماں ہُونا پڑے گا اِن زمینوں کے لیے

○

ہَوا کے رخ پہ کنارہ نہیں بنانا مجھے
جو بن چُکا ہے دوبارہ نہیں بنانا مجھے

کوئی بھی خواب نہیں لانا مجھ کو کاغذ پر
کہیں بھی نقش تمہارا نہیں بنانا مجھے

خجل ہُوا ہُوں مَیں اِس کائنات میں کیا کیا
بنانے والے دوبارہ نہیں بنانا مجھے

مَیں روح پھونکنے آیا ہُوں خشک مٹی میں
روا روی میں یہ گارا نہیں بنانا مجھے

مجھے بنانا ہے اِک رنگ سات رنگوں سے
مگر برائے نظارا نہیں بنانا مجھے

تو پھر مَیں کون سا منظر بنانے آیا ہُوں
جو لفظ اشارہ نہیں بنانا مجھے

اُڑا کے خاک بنانا ہے آسماں آزر
اور اُس پہ کوئی ستارہ نہیں بنانا مجھے

○

کسی کے دھیان کی لَو سے لِپَٹ کے آگئی ہے
ہماری آنکھ میں دنیا سمٹ کے آگئی ہے

کہا بھی تھا کہ فضا سازگار ہُونے دو
پتنگ صحنِ تمنا میں کٹ کے آگئی ہے

جو آفتاب میں رکھی تھی دستِ قدرت نے
وہ روشنی بھی چراغوں میں بَٹ کے آگئی ہے

تمام لفظ ملیں گے گذشتہ معنوں سے
ہَوا کتاب کے اوراق اُلٹ کے آگئی ہے

تمہارے ہجر کا موسم ابھی نہیں گذرا
مگر یہ لہر اُداسی سے ہَٹ کے آگئی ہے

نفَس کی آمد و شُد خوشں گوار کیسے ہو
حیات راہ کی مٹی سے اَٹ کے آگئی ہے

تو کیا ملے گی ہمیں مہلتِ سکوں آزرؔ
تو کیا وہ ساعتِ خوش رو پلَٹ کے آگئی ہے

O

کس طرح پہنچیں وہاں تک سوچ کر بے تاب ہیں
سندھ میں سرسوں کھلی ہے اور ہم پنجاب ہیں

جاگ کر اِن منظروں کی وقت پر تصویر کھینچ
یہ کھلی آنکھوں سے دیکھے جانے والے خواب ہیں

آؤ مل کر اک نیا طوفان اُٹھائیں بحر سے
تم سرِ آبِ رواں ہو ہم پسِ گرداب ہیں

تیری خوشبو سونگنے کو پھول ہیں ترسے ہُوئے
تیری صورت دیکھنے کو آئینے بے تاب ہیں

درد مت جانو اِسے یہ دین ہے احباب کی
اشک مت سمجھو اِنہیں یہ گوہر نایاب ہیں

حضرتِ انسان سے لے کر خدائے حرف تک
سب محبت کے ہمیں بخشے ہُوئے القاب ہیں

ہو نہ ہو آزر اسے گوندھا گیا تیزاب میں
جسم کے سب ذائقے تاثیر میں سیماب ہیں

O

صحرا کی اشتہا نہ سمندر کے خوف سے
ترکیب پا رہا ہُوں مَیں اندر کے خوف سے

چندھیا گئی ہے روشنی آنکھوں میں ڈوب کر
دھندلا گیا ہے آئنہ منظر کے خوف سے

سائے میں جسم ڈھل گئے آسیب جل گئے
اندر کا خوف مر گیا باہر کے خوف سے

رنگوں کا جال بچھ گیا پھولوں کی لاش پر
تتلی کی نیند اُڑ گئی بستر کے خوف سے

پامال ہو رہا ہے ہواؤں کا قافلہ
خوشبو رکی ہوئی ہے گُل تر کے خوف سے

اے دوست اب کے مدِمقابل کوئی نہیں
کمزور پڑ گیا ہوں برابر کے خوف سے

اُس کے لیے تو خودکشی آزرؔ حلال ہو
کچھ بھی نہ کر سکے جو مقدر کے خوف سے

○

لگن کی شاہ راہ سے بدن کی کارگاہ تک
تڑخ چکے ہیں آئینے چٹخ چکی نگاہ تک

دمک رہا ہے خاکداں دھڑک رہا ہے آسماں
چمک رہے ہیں جسم و جاں سپیدی و سیاہ تک

بیاں ہو کیسے شرحِ غم کہاں سے بات ہو شروع
کہاں پہ کھیل ختم ہو، ابد کی خانقاہ تک

مٹے ہوئے ہیں نقشِ پا عدم کی رہگذار ہے
نظر نظر غبار ہے پس اُن کی بارگاہ تک

نگاہ سینت کے رکھو قدم اُٹھاؤ دھیان سے
سفر طویل ہے مگر چلیں گے مہر و ماہ تک

وہ لفظ تھا کہ اسم تھا وہ لمس تھا کہ جسم تھا
عجیب سا طلسم تھا نظارہ و نگاہ تک

سفید پھول کھِل اُٹھے لہو کا نم لیے ہوئے
فصیلِ شہرِ خواب سے دیارِ کج کلاہ تک

O

یہ اِک فقیر کا حجرہ ہے آ کے چلتے بنو
پڑی ہے طاق پہ دنیا اُٹھا کے چلتے بنو

جہانِ فانی ہے مت سوچنا سکونت کا
بس اپنے نام کا سکہ بٹھا کے چلتے بنو

اِب اِس کے بعد شکاری کمان کھینچے گا
تم اُس سے پہلے ذرا پھڑ پھڑا کے چلتے بنو

ہے بھیڑ ساقیء کوثر کو دیکھنے کے لیے
سب اپنی پیاس بجھاؤ بجھا کے چلتے بنو

نہیں ہے فائدہ اب کوئی سینہ کوبی کا
بہانے آئے تھے جو خوں بہا کے چلتے بنو

ہُوا ہُوں تلخ تو باعث بھی لازمی ہے کوئی
مَیں تُم سے اِس لیے روٹھا ہُوں تاکہ چلتے بنو

سجی رہے گی یونہی بزم حشر تک آزر
تُم اپنے شعر سُناؤ سُنا کے چلتے بنو

لیاقت جعفری　　ڈاکٹر محمد سلیم　　عمر فرحت

"دلاور علی آزر کی شاعری سے گزرتے ہوئے جدید اُردو غزل پر میرا ایمان مزید پختہ ہوگیا ہے۔ شعر کہتے تو بہت سے اور بھی ہیں مگر شعر کو شعر بنانا کسی کسی کو ہی آتا ہے۔ یہ شاعر مجھے چند ہی دوسروں کے ساتھ اگلی صف میں کھڑا دکھائی دیتا ہے، اس کی اُٹھان سے پتا چلتا ہے اس کا لہجہ اسقام سے پاک اور خود اعتمادی کا جذبہ حیران کُن ہے۔ یہ غزلیں تازگی اور تاثیر کا ایک ایسا جھونکا ہے جس نے اردگرد کی ساری فضا کو معطر کر دیا ہے اِس شاعری نے مجھے مسرت سے ہمکنار کیا ہے۔ میری دُعائیں اس شاعر کے ساتھ ہیں۔ یہ اعلیٰ و عمدہ شاعری چھاپنے پر ادارہ تفہیم کو میری طرف سے دلی مبارک باد۔"

ظفر اقبال

پاکستان

"اس انتخاب میں شامل غزلیں واقعی بہت اہم ہیں ان میں شعریت بھی ہے تاثیر بھی اور تازہ کاری بھی مزہ دیتی ہے۔ دلاور علی آزر کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں جن میں عصر حاضر کے شعر و ادب سے ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے اس کا مطالعہ منفعت رہے گا۔ دلاور علی آزر نے غزل میں رمزیاتی اور ایمائی کیفیت سے دور ہوئے بغیر اپنے عہد کی سماجی بصیرت کو نہایت موثر شاعرانہ پیرائے میں پیش کیا ہے اُن کی غزلوں میں یہ بصیرت اور دردمندانہ احساس نمایاں نظر آتا ہے اس انتخاب کو شائع کرنے کے لیے میری طرف سے ادارہ تفہیم کو ڈھیروں مبارک باد۔"

شمیم حنفی

دہلی (انڈیا)

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-86624-21-5